Scanned with CamScanner

غالب

شاعر و مکتوب نگار

پروفیسر نورالحسن نقوی

ایجوکیشنل بک ہاؤس ـــ علی گڑھ

ایڈیشن ------ ۲۰۰۰ء
قیمت ------ ۴۸/۰۰

کتابت : ریاض احمد، الہ آباد
مطبع : ایم۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز، دہلی

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲
فون ۴۰۰۶۸

ترتیب

عرضِ ناشر

غالبؔ کی شخصیت، شاعری اور مکتوب نگاری پر بہت سی کتابیں بازار میں دستیاب ہیں۔ بعض خاصی ضخیم اور مباحث کے اعتبار سے مشکل ہیں تو بعض معلومات کے لحاظ سے تشنہ۔ مدّت سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں غالبؔ کی زندگی اور فن کو دقیق مباحث میں الجھے بغیر اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ پورے غالبؔ ہمارے سامنے آجائیں۔ جن پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری ہو وہاں تفصیل کو اور جن گوشوں پر مختصر گفتگو کافی ہو وہاں اختصار کو ملحوظ رکھا جائے۔ زبان آسان اور عام فہم ہو اور اندازِ بیان دلنشیں۔ نظرِ انتخاب پروفیسر نورالحسن نقوی پر ٹھہری جن کی کتابیں ہم آپ شوق سے پڑھتے رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری درخواست پر انھوں نے ایک ایسی کتاب تیار کر دی ہے جو عوام و خواص کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ طلبا کی ضرورتوں کو بھی بہ خوبی پورا کرتی ہے۔ امید ہے پروفیسر نورالحسن نقوی کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا۔

اسد یار خاں

حرفِ آغاز

غالبؔ کے فکر و فن پر یہ مختصر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اس عظیم فن کار کی زندگی کے حالات اختصار کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں غالب کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے ساتھ ہی کلامِ غالب کا انتخاب دے دیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں غالبؔ کی مکتوب نگاری پر گفتگو کی گئی ہے اور منتخب خطوط کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

غالب کی داستانِ حیات

عزم و ہمت اور پامردی کی بے مثال روداد ہے ــــــ

حد درجہ دلچسپ، نہایت سبق آموز، نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرنے والی اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھانے والی۔ غالبؔ نے ایک جگہ شکایت کی ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شاعر کی زندگی کس شکل سے گزری جس کا اس شعر میں گلہ کیا گیا ہے ؟ اس کی شرح کی جائے تو زمانے کی ناقدری، زندگی بھر کی تنگ دستی، اخیر عمر کی بیماری، شاعر کی سبھی تکلیفوں کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ یہ سارے غم، یہ ساری تکلیفیں انھیں زیر نہ کر سکیں۔ ان کی خوش دلی نہ چھین سکیں اور ان کی مسکراہٹیں کم نہ کر سکیں۔ جو زندگی ایسی بے نظیر حوصلہ مندی سے عبارت ہو اس کے بارے میں واقفیت بذاتِ خود ایک مفید تعلیم ہے۔ اس وجہ سے غالب کے سوانحی حالات کو شامل کتاب کیا گیا۔ اس کا دوسرا سبب اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ فن کار کے عہد، ماحول اور اس کے حالاتِ زندگی کو جانے بغیر اس کی تخلیق کو سمجھنا ممکن ہے نہ سراہنا۔

فن کار کی شخصیت اور اس کا عہد و ماحول اس کے فن پر بڑی شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ اثرات کہیں بہت واضح اور نمایاں ہوتے ہیں، کہیں مبہم اور صرف ایک زیریں لہر کے طور پر۔ شاعری میں حالات و حادثات کا صاف صاف بیان ممکن نہیں۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے اشارے کنایے میں کہا جاتا ہے۔ غالب نے ایسا ہی کیا۔ بہر حال عرض صرف یہ کرنا ہے کہ غالب کے حالاتِ زندگی کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں۔

غالب کی شاعری

اس کتاب کے دوسرے مضمون کا موضوع ہے۔ غالب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ یہی وہ صنفِ سخن ہے جسے انھوں نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور اسی صنف کی بدولت انھیں حیاتِ جاوداں نصیب ہوئی۔ غالب نے غزل کی وادی میں قدم رکھا

تو یہ وادی بہت تنگ تھی۔ اس کے موضوعات عشق و عاشقی تک محدود تھے۔ غالبؔ نے اسے وسعت عطا کی اور حقیقی زندگی سے متعلق موضوعات اس میں داخل کیے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اردو غزل کو فکر کے عنصر سے روشناس کیا۔ غرض انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا۔ اور اس کے صلے میں غزل نے غالبؔ کو شہرتِ دوام عطا کی۔

غالبؔ مثنوی نگاری کی بھی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر ادھر متوجہ ہوتے تو لافانی مثنویوں کا ایک ذخیرہ ان سے یادگار ہوتا۔ مگر وہ اس طرف ملتفت نہ ہوئے کیوں کہ اس صنف کا تسلسل اور طوالت (مثنوی مختصر ہو تو اسے وقعت حاصل نہیں ہوتی) یکسوئی اور جاں کاہی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جن حالات سے وہ دوچار تھے ان میں یکسوئی ناپید تھی۔

قصیدہ گوئی کے لیے جس انداز کی مدح گوئی درکار تھی اس کی طرف ان کا دل مائل نہ تھا مگر اس صنف کو اپنانا پڑا ضرورتاً، یعنی کاربرآری کے لیے حصول منفعت کے لیے اور اپنی بے حساب ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لیکن قصیدہ نگاری کے لیے انھوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق وہ رنگ سخن اختیار کیا جو دوسروں سے الگ تھا اور جس کی بدولت انھیں ایک ممتاز و منفرد قصیدہ نگار کا رتبہ حاصل ہوا۔ اسی لیے اس باب میں غالب کی قصیدہ نگاری کا بطور خاص جائزہ لیا گیا ہے۔

غالب کی مکتوب نگاری اردو ادب کے طالب علم کے لیے نہایت اہم موضوع ہے۔ ان مکاتیب کے بغیر اردو نثر ترقی کی منزلیں طے نہ کر پاتی اور آج اس میں اتنی توانائی نہ ہوتی کہ

ہر مضمون اور ہر موضوع کے متعلق سہولت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جا سکے غالبؔ نے اپنا دل بہلانے کے لیے، وقت گزاری کے لیے اور دوستوں کو خوش کرنے کے لیے مکتوب نگاری کے شغل کو اپنایا اور قلم برداشتہ مکاتیب تحریر کیے۔ اس طرح ہماری زبان میں بے تکلف نثر نگاری کی بنیاد پڑ گئی اور اس بنیاد پر جدید اردو نثر کی پرشکوہ عمارت تعمیر ہوئی۔

خطوطِ غالب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان میں مکتوب نگار کی مکمل سوانح محفوظ ہوگئی ہے۔ عہدِ غالب کا ہندوستان ایک ایسے انقلاب سے گزر رہا تھا جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا اور اس میں سب سے اہم رول ادا کیا ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے۔ غالبؔ نے یہ خونیں ڈراما بچشم خود دیکھا اور اس کے بارے میں بہت کچھ ان خطوں میں درج کر دیا۔ چنانچہ ان خطوط کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ کہیں مصنف کے حالاتِ زندگی نظر آتے ہیں، کہیں ان کے عہد و ماحول کی تصویریں۔ نثر کے کئی روپ جا بجا ہماری توجہ کو اسیر کرتے ہیں۔ کہیں سیدھا سادہ بیان ہے۔ کہیں عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی۔ کہیں افسانے کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے تو کہیں مکمل ڈراما پیش نظر ہو جاتا ہے۔ بہت غور و فکر اور تلاش کے بعد ایسے خطوط کا انتخاب کیا گیا ہے جن کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

غالبؔ پر بے شمار مضامین لکھے گئے، ان گنت کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن ایک کتاب جس کا مطالعہ اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے بہت سود مند

ہے وہ ہے مولانا الطاف حسین حالؔی کی یادگار غالب۔

یادگارِ غالبؔ پہلی کتاب ہے جس میں غالبؔ کی زندگی کے معتبر حالات تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں اور ان کے سرمایۂ نظم و نثر کا غیر جانب داری کے ساتھ بھرپور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مولانا الطاف حسین حالؔی کی تصنیف ہے جنھیں غالبؔ کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔
ایک خیال یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ حالی ان کے شاگرد نہیں تھے احتراماً انھیں استاد کہتے تھے کیوں کہ انکسار اور بزرگوں کا احترام حالؔی کے مزاج کا خاصہ تھا لیکن یہ رائے درست نہیں۔ مولانا حالؔی کے اپنے بیان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا ۱۸۵۴ء میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی آئے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ شعر و ادب کا کوئی قدر شناس دہلی آئے اور غالبؔ سے نیاز حاصل نہ کرسکے۔ مولانا بھی غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی شخصیت سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ باقاعدگی سے حاضری دیتے رہے۔

اس دوران میں غالب کے اردو فارسی کلام کے مشکل مقامات انھوں نے خود شاعر سے سمجھے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ غالب نے اپنے چند قصیدے انھیں سبق کی طرح پڑھائے۔ مولانا حالؔی کا کلام دیکھ کر انھوں نے فرمایا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے"۔ یہ بیانات صاف بتاتے ہیں کہ مولانا حالؔی نے باقاعدہ طور پر غالبؔ کی شاگردی اختیار کی تھی۔ غرض دونوں کے درمیان ربط ضبط بڑھتا رہا اور یادگارِ غالبؔ کے مصنف کو اردو

ادب کی اس اہم شخصیت کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔

جب مولانا نے یادگارِ غالب لکھنے کا ارادہ کیا تو غالب سے ملاقاتوں کے بارے میں جو کچھ انھیں یاد آیا دماغ پر زور ڈال ڈال کے اس سب کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ اپنے استاد کا کلامِ نثر و نظم انھوں نے پہلے بھی بغور پڑھ رکھا تھا لیکن ایک بار پھر اس کا مطالعہ کیا۔ اس وقت ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جنھوں نے غالب کو قریب سے دیکھا تھا اور ان کے بارے میں مستند معلومات رکھتے تھے۔ مولانا نے ان سب کو خط لکھ کر درخواست کی کہ غالب سے متعلق جو معلومات ان کی دسترس میں ہے وہ یادگارِ غالب کے مرتب کو عنایت فرمادیں۔ ان میں سے بیشتر حضرات نے مولانا سے قلمی تعاون کیا اور معلومات کا ایک بیش بہا اور معتبر ذخیرہ فراہم ہوگیا۔

مولانا نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے یادگار غالب مکمل کی اور بلاشبہ تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کے سوانحی حالات اور اخلاق و عادات کا تفصیلی بیان ہے۔ دوسرے حصے میں غالب کے کلام نظم و نثر کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور نہایت انصاف سے کام لیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق پر قلم اٹھایا تو بے جا تعریف و توصیف پر اتر آئے۔ مولانا حالی کا یہ شیوہ نہیں۔ وہ تنقید میں دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔

مولانا نے غالب کے چند لطائف و ظرائف بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ایسے چٹکلے اور لطیفے اتنے ہیں کہ لکھو تو پوری کتاب ہو جائے اس لیے

انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ انھیں غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز نہ کر دیتے تو ہمارے آپ کے لیے یہ بیش بہا سرمایہ ہوتا۔ مولانا حالی اپنی متانت و سنجیدگی کے باوجود غالب کی ظرافت کے بہت قائل ہیں اور انھیں حیوانِ ظریف کے لقب سے یاد فرماتے ہیں۔

یادگار غالب کی زبان سادہ وسہل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دلکش ہے۔ یہ کتاب ایک تو اس لیے مقبول ہوئی کہ یہ ہماری زبان کے ایک بلند پایہ شاعر و مکتوب نگار کے بارے میں ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس کا اندازِ بیان نہایت دل آویز ہے۔ غالب کے بارے میں اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ غالب پر جو سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں ان سب میں یادگار غالب سے پوری طرح استفادہ کیا گیا۔

اس کتاب نے غالب کی شاعری اور ان کی مکتوب نگاری کی خوبیوں سے عوام وخواص کو روشناس کیا اور ان کی شہرت کو دور دور تک پہنچا دیا۔

⁂

غالب کی سوانح اور ان کے کلامِ نظم ونثر پر بلاشبہ سیکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ پھر اس کتاب کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ اس سوال کا جواب عرضِ ناشر کے عنوان سے ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک جناب اسد یار خاں دے چکے ہیں۔ ہمارا جواب صرف یہ ہے کہ ہم نے خاں صاحب کی فرمائش پر یہ خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھوائی ہے خدا کرے وہ پورا ہو۔

علی گڑھ: اپریل ۲۰۰۰ء

—— نورالحسن نقوی

حالاتِ زندگی

ایک انگریزی نظم میں کہا گیا ہے کہ "عظیم ہستیاں وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ نقشِ قدم آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے ہیں"۔ ایسی شخصیتوں کی سوانح عمریاں بڑی سبق آموز ہوتی ہیں، جن کی خوبیاں اپنی پیروی کی ترغیب دیتی ہیں اور لغزشیں پکار پکار کے کہتی ہیں کہ خبردار ہمارے نزدیک نہ آئیو ورنہ پچھتاؤ گے۔

غالبؔ کا شمار ایسی ہی ہستیوں میں ہے۔ ان کا سرمایۂ نثر و نظم اردو ادب کا لافانی شاہکار ہے اور ان کی روداد زندگی عزم و ہمت کی ایک لاثانی داستان! عمر بھر آلام و مصائب سے سروکار رہا مگر کبھی حوصلے پست نہ ہوئے۔ مردانہ وار ہر مصیبت کا مقابلہ کیا اور ساری زندگی اپنی پامردی پر فخر کیا۔ دوستوں اور عزیزوں کو بھی ہمیشہ یہی تلقین کی کہ دیکھو کبھی ہمت نہ ہارنا۔ مرزا حاتم علی مہر کو کئی خطوں میں غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا تو اپنی خاص شوخی و ظرافت کو کام میں لاتے ہوئے لکھا کہ کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کیسی۔ یہ تو خوشی

کی بات ہے ۔ اللہ برکت دے ۔ اگر غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو۔ غالب کے حالاتِ زندگی مصیبتوں سے پنجہ لڑانے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں اس لیے قابلِ مطالعہ ہیں ۔

ہمارے اس عظیم فن کار میں خوبیاں بھی تھیں ، خامیاں بھی۔ وہ ادھورے نہیں پورے انسان تھے اور کبھی یہ تسلیم کرتے نہیں شرمائے کہ انسان ہوں، انسانی کمزوریاں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں (خوئے آدم دارم آدم زادہ ام) لیکن ان کی ایک خوبی ایسی ہے جو ساری کمزوریوں پر حاوی ہے اور آج کے دور میں اس کی پیروی بہت ضروری ہے ۔ انھوں نے ہر ایک سے محبت کی اور جواب میں ہر ایک کی محبت پائی ۔ خط پڑھ کر دیکھ لیجیے ہر کسی کے غم سے غمگین ، ہر کسی کی خوشی پر مسرور نظر آتے ہیں ۔ لگتا ہے سارے جہاں کا درد ان کے دل میں سما گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ملک پر قیامت ٹوٹی تو گوروں نے کالوں کو مارا، کالوں نے گوروں کو۔ درد مند دل رکھنے والے اس انسان نے ہر ایک کی موت پر آنسو بہائے۔ ہمیشہ یہ کہا کہ ہندو ہو، مسلمان ہو، نصرانی (عیسائی) ہو ، میں ہر ایک کو اپنا بھائی مانتا ہوں ۔ کاش ان کا یہ پیغام ہمارے دلوں میں گھر کرلے ۔

مختصر یہ کہ غالب کے حالات زندگی کا مطالعہ کیجیے تو ذہن کو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے اور دل میں ان کی طرح بلند حوصلگی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے ۔

غالبؔ کی خود نوشت

غالبؔ نے اپنی سوانح عمری نہیں لکھی مطلب یہ کہ انھوں نے اپنی زندگی کے حالات کبھی کتاب کی صورت میں تحریر نہیں کیے لیکن مختلف خطوط میں اپنی زندگی کے تمام حالات تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ ان تحریروں کو یک جا کر کے ترتیب دے دیا جائے تو ان کی مکمل سوانح عمری تیار ہو جاتی ہے۔ کئی اہلِ قلم نے یہ خدمت انجام دی ہے۔

اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کو اپنی زندگی کے حالات قلمبند کرنے میں لطف آتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ انھیں اپنی عظمت کا احساس تھا۔ یقیناً جانتے تھے اور خوب جانتے تھے کہ ان کے پرستاروں کو ایک دن ان کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو جاننے کی خواہش ہو گی۔ اس لیے اپنی تحریروں میں جہاں تک ہو سکا اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر دیں۔ علاوہ ازیں علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں تو اپنی زندگی کے تمام حالات تمثیل کے پیرایے میں بیان کر دیے۔ ملاحظہ فرمائیں :-

"سنو عالم دو ہیں۔ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملك اليوم اور پھر جواب دیتا ہے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم

عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقتِ مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں سالِ گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ (۱۲۷۷ھ) میں چھوٹ جاؤں۔ بہرتقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔"

غالبؔ کی زندگی کا ایسا کون سا واقعہ ہے جو اس خط میں اشارے کنایے میں بیان نہ ہو گیا ہو۔ تفصیل آگے آتی ہے اس لیے تشریح کو غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز کیا جاتا ہے۔

غالبؔ نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ ان کی زندگی کے اہم ترین واقعات کو بھی چند صفحوں میں سمیٹ لینا سمندر کو ایک بوند پانی میں سمو لینے کے برابر ہے۔ تاہم اہم واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خاندان

غالبؔ سلجوقی ترکوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا بقول غالبؔ شاہ عالم کے عہد حکومت میں ماوراءالنہر سے ہندوستان آئے۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ شاہ عالم کا نہیں محمد شاہ کا تھا۔ دہلی آنے سے قبل لاہور میں نواب معین الملک سے بہ سلسلۂ ملازمت وابستہ ہوئے۔ نواب کی وفات کے بعد دہلی آئے۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ ونشان سے بادشاہ کے نوکر ہوئے۔ پہاسو کا پرگنہ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے عطا ہوا۔ یہیں ان کے والد عبداللہ بیگ کی ولادت ہوئی۔

دہلی میں ابتری پھیلی تو عبداللہ بیگ لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کے، پھر حیدر آباد کے نواب نظام علی خاں کے اور پھر الور کے راجا بختاور سنگھ کے ملازم ہوئے اور وہیں کسی جنگ میں مارے گئے۔ غالبؔ کے چچا نصراللہ بیگ

مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبیدار تھے۔ معقول جاگیر ملی ہوئی تھی۔ وہی اپنے بھتیجے کے کفیل تھے۔ نصراللہ بیگ کی اچانک موت ہوگئی تو رسالہ برطرف کر دیا گیا۔ جائداد کے عوض نقد رقم مقرر ہوئی۔ اس کا ایک حصہ غالبؔ کو ملتا رہا۔ پانچ برس کی عمر تھی کہ والد نے وفات پائی، نو برس کے تھے کہ چچا بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان تھے اور آسودہ حالی کی زندگی گزارتے تھے۔ آگرہ کے رئیسوں میں ان کا شمار تھا۔ عبداللہ بیگ خاں ان کے خانہ داماد تھے

ولادت، تعلیم و تربیت

۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو یعنی اواخر ۱۷۹۷ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں عبداللہ بیگ کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اسداللہ بیگ نام رکھا گیا۔ عرفیت میرزا نوشہ طے پائی۔ بہت بعد کو یعنی ۴ر جون ۱۸۵۰ء کو آخری مغل بادشاہ نے نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ کے خطاب سے نوازا تو پورا نام اس طرح ہوگیا ــــــ

نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ اسداللہ بیگ خاں عرف میرزا نوشہ

اس زمانے کا دستور تھا کہ امیرزادے گھر پر ہی تعلیم پاتے تھے۔ میرزا نوشہ کی تعلیم کا آغاز بھی اسی طرح گھر پر ہوا۔ شیخ معظم ایک معلم آگرے میں اتالیقی کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ انھیں اس کام پر مامور کیا گیا۔ لیکن لڑکے کا دل کھیل کود، چوسر، شطرنج جیسے تفریحی مشاغل پر مائل تھا۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی ہوگئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

غالب کا اپنا بیان ہے کہ شادی کے اگلے سال جب ان کی عمر چودہ برس کی تھی، فارسی عربی کا ایک عالم ملا عبدالصمد ہرمزد آگرے آیا۔ غالب نے اس سے عربی فارسی سیکھی اور ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرلی۔ یہ سب افسانہ طرازی ہے۔ ملا عبدالصمد ہرمزد نام کے کسی عالم کا ہندوستان آنا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ غالب نے خود ایک خط میں لکھا ہے کہ بے استاد نہ کہلاؤں اس لیے میں نے ملا عبدالصمد نام کا ایک عالم تراش لیا۔ اصلیت یہ ہے کہ غالب نے جو کچھ سیکھا اپنی کوشش سے سیکھا۔ بہت ذہین تھے جو کتاب ایک بار دیکھ لی اس کے مطالب ذہن نشین ہو گئے۔ ایک خط میں غالب نے اپنی اس صلاحیت کا بھی ذکر کیا ہے۔

شادی تیرہ برس کی عمر تھی کہ امراؤ بیگم سے شادی ہو گئی جن کی عمر اس وقت گیارہ برس تھی۔ یہ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ معروف نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔

غالب کی بعض تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی سے ان کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے۔ اس سلسلے میں اکثر اس خط کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں غالب نے اپنی بیوی کو پھانسی کا پھندا کہا ہے اور لکھا ہے کہ نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ایک ظریف انسان تھے۔ بہت سی باتیں ہنسی دل لگی میں لکھی ہیں۔ انھیں سچ ماننا غلط ہوگا۔ کئی خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں آپس میں محبت کرتے تھے اور ایک دوسرے کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔

امراؤ بیگم سے غالب کے سات اولادیں ہوئیں مگر سب کی شیر خواری کے زمانے میں موت ہوگئی۔ پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہ جیا۔ آخر انھوں نے امراؤ بیگم کے بھانجے میرزا زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنا لیا۔ دونوں ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ جوانی میں مر گئے تو غالب نے ان کا بہت پر درد مرثیہ کہا۔ اس کے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لازم تھا کہ دیکھو کہ مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

عارف کے دو بیٹے تھے۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کی وفات کے بعد غالب اور امراؤ بیگم نے حسین علی خاں کو گود لے لیا۔ کچھ دنوں بعد باقر علی خاں بھی۔ یہیں آکر رہنے لگے۔ ان دونوں سے غالب اور ان کی بیگم کو بہت پیار تھا۔ غالب کے خطوں میں اِن بچوں کا ذکر موجود ہے۔

شوہر کی وفات کے وقت امراؤ بیگم حیات تھیں۔ ایک روایت کے مطابق شوہر کے چھ مہینے بعد اور دوسری روایت کے مطابق پانچ برس بعد وفات پائی۔

دہلی میں اقامت

غالب کا مولد یعنی جائے پیدائش تو اکبر آباد (آگرہ) تھی اور یہ شہر انھیں عزیز بھی بہت تھا ہمیشہ

محبت سے اسے یاد کرتے تھے لیکن جس طرح کی زندگی گزارنے کے وہ آرزو مند تھے اس کے لیے دہلی ہی موزوں تھی۔ آخر کار ان کی نظرِ انتخاب اسی شہر پر پڑی۔ دہلی میں آمد و رفت کا سلسلہ سات برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا لیکن مستقل رہائش کی صورت اس کے دس بارہ سال بعد نکل سکی۔ جس عیش و آرام کی تمنا رکھتے تھے وہ دہلی میں کبھی میسر نہ آیا۔ بَلی ماران، گلی قاسم جان اور اس کے قرب و جوار میں رہائش رہی۔ ذاتی مکان زندگی بھر میسر نہ آیا۔ کرایے کے مکانوں میں رہائش رہی۔ دو ایک بار ایسے مکان بھی ملے جن کا کرایہ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مرتے دم تک دہلی ہی میں قیام رہا۔ یہیں شہرت پائی، یہیں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں اور یہیں سپردِ خاک کیے گئے۔

شاعری کا آغاز

شعر و شاعری سے طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ کم عمری سے ہی اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگے تھے۔ اردو شعر گوئی کا آغاز پہلے ہوا اور انھوں نے اسدؔ تخلص اختیار کیا۔ پھر فارسی میں شعر کہنے لگے تو غالبؔ تخلص اپنایا۔ آگے چل کر اردو میں بھی اکثر یہی تخلص استعمال کرتے تھے لیکن ضرورتِ شعری کی بنا پر بعض غزلوں میں اسدؔ تخلص بھی جگہ پاتا تھا۔ کہیں کہیں تو پورا نام بھی رکھ دیا ہے جیسے: مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں۔

ایک بار ایسا واقعہ پیش آیا کہ اسدؔ تخلص کو بالکل ترک کر دیا۔ غالبؔ سے پہلے ایک شاعر میر امانی اسدؔ گزرے تھے۔ ان کا انداز بالکل مختلف تھا۔ کسی نے غالبؔ کے سامنے یہ مطلع پڑھا اور خوب داد دی۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر، شاباش رحمت خدا کی

غالب نے فرمایا کہ یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ ایک شاگرد منشی شیو نراین آرام نے میر امانی اسد کے ایک شعر کو غالب کا سمجھ لیا اور لکھا کہ اپنی وہ غزل جس کا ایک مصرع ہے "اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں" مجھے بھیج دیجیے۔ انھیں جواب دیا کہ اس غریب کو تو میں کیا کہوں لیکن یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ میر امانی اسد کے شعروں کو غالب سے منسوب کیا جانے لگا تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ تخلص بالکل ترک کر دیا۔

یہاں اتنی بات اور عرض کرنی ضروری ہے کہ غالب نے فنِ شعرگوئی میں کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا، نہ اس سلسلے میں کسی سے صلاح مشورہ کیا۔ ان کے اپنے شعری ذوق اور خداداد شعری صلاحیت نے رہنمائی کی اور بس۔

پنشن کا مقدمہ

غالب کے خطوں میں پنشن کے مقدمے کا جا بجا ذکر ہے اور ان کی زندگی پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے اور اس کا ذہن نشین ہونا آسان نہیں۔ یہاں بہت اختصار کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد چچا نصراللہ بیگ خاں نے غالب کی کفالت کی۔ یہ لارڈ لیک کی ماتحتی میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے۔ ایک معقول جاگیر ملی ہوئی تھی۔ اچانک ان کا انتقال ہو گیا تو جاگیر واپس لے کر ان کے متعلقین کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر کر دی گئی۔

فیروز پور جھرکہ کے نواب احمد بخش خاں جاگیردار تھے اور پچیس ہزار روپے سال بطور مالگذاری سرکار کو ادا کرتے تھے۔ انھیں ہدایت دی گئی کہ اس میں سے دس ہزار روپے سال نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں کو دیے جائیں۔ اس کا غالب کو علم تھا۔ نواب احمد بخش خاں نے کسی طرح دوسرا حکم نامہ حاصل کر لیا جس میں کہا گیا تھا کہ دس ہزار کے بجائے پانچ ہزار دیے جائیں۔ ان پانچ ہزار کی تقسیم کے بارے میں حکم دیا گیا کہ پندرہ سو روپے سال نصر اللہ بیگ کی والدہ اور بہنوں کو، پندرہ سو روپے سال میرزا نوشہ یعنی غالب اور ان کے بھائی میرزا یوسف کو اور دو ہزار روپے سال خواجہ حاجی کو دیے جائیں۔ خواجہ حاجی نصر اللہ بیگ کا رشتہ دار نہیں تھا لیکن جب ان کا رسالہ برطرف ہو گیا تو پچاس سوار باقی رہ گئے تھے اور ان کا افسر خواجہ حاجی تھا اس لیے اس کی تنخواہ بھی مقرر ہوئی۔

غالب دوسرے حکم نامے سے بے خبر تھے۔ لہٰذا وہ متواتر سرکار انگریزی میں یہ درخواست پیش کرتے رہے کہ نواب احمد بخش دس ہزار کے بجائے نصر اللہ بیگ کے وارثوں کو صرف تین ہزار روپے دے رہا ہے اور دو ہزار خواجہ حاجی کو غلط دیے جا رہے ہیں کیوں کہ اس کا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔

غالب نے اس سلسلے میں تگ ودو کی، کلکتے کا سفر کیا، انگریز افسروں سے ملاقاتیں کیں، بارسوخ حکام کی سفارشیں بہم پہنچائیں لیکن کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ ان کے خلاف فیصلہ ہو گیا۔ اپیل کی گئی۔ وہ بھی رد ہو گئی۔

نواب شمس الدین خاں فیروز پور جھرکہ کے رئیس مقرر ہو گئے تھے کیوں کہ نواب احمد بخش خاں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک انگریز افسر

ولیم فریزر کا قتل ہوگیا۔ نواب شمس الدین خاں ملوث پائے گئے۔ انھیں پھانسی دی گئی اور ان کی جاگیر ضبط ہوگئی۔ اب غالبؔ کو براہِ راست سرکار انگریزی کے خزانے سے پنشن ملنے لگی۔ اس اثنا میں غدر برپا ہوگیا۔ غالبؔ گوشہ نشین ہوگئے مگر اس الزام سے نہ بچ سکے کہ باغیوں کے ہمدرد تھے اور باغیوں کی خوشامد کرتے تھے۔ پنشن بند ہوگئی اور خلعت و دربار بھی موقوف ہوگیا۔ اس کا پنشن بند ہونے سے زیادہ غم تھا کیوں کہ یہ نشانِ امارت تھا۔

انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کامیابی ہوئی اور ۴؍ مئی ۱۸۶۰ء کو تین سال کی رکی ہوئی رقم ایک ساتھ مل گئی۔ قرض ادا ہوگیا۔ عزت بحال ہوگئی۔ دربار و خلعت کو وہ پنشن سے زیادہ اہم خیال کرتے تھے۔ اس کی کوشش جاری رہی۔ دو سال بعد اس مہم میں بھی کامیاب ہوئے۔

آمدنی کے دیگر ذرائع

غالبؔ کے ذرائع آمدنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو ماہانہ یا سالانہ تھے۔ دوسرے وہ جو بطور انعام، امداد یا نذر وقتاً فوقتاً کہیں سے مل جاتے تھے۔ پنشن کے ملنے، بند ہونے، پھر سے جاری ہونے کی تفصیل اوپر پیش کی جا چکی۔ یہ تصدیق نہ ہو سکی کہ غالبؔ کی وفات کے بعد پنشن کا کوئی حصہ گزارے کے طور پر ان کی بیگم کے نام جاری ہوا یا نہیں۔ اس کے علاوہ آمدنی کے دیگر ذرائع کا اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ قلعۂ معلی سے غالبؔ کا باقاعدہ تعلق تھا۔ ۱۸۵۰ء میں بادشاہ دہلی

نے انھیں خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا تھا۔ پچاس روپے ماہانہ اس کام کی تنخواہ مقرر ہوئی تھی اور خلعت کے علاوہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ حالات فراہم کرنے کا کام حکیم احسن اللہ خاں کے سپرد تھا۔ غالب ان حالات کو ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے۔ اس کتاب کا نام "مہرِ نیم روز" تھا۔ اس کا حصہ اوّل ۱۸۵۴ء میں مکمل ہوا۔ اس میں ابتدا سے لے کر ہمایوں کی وفات تک کے حالات درج تھے۔ دوسرا حصہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سبب مکمل نہ ہو سکا۔

اس سے پہلے بھی غالب کا قلعے میں آنا جانا تھا۔ مدح گوئی کے عوض خلعت و انعام پا چکے تھے۔

۲۔ نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور سے بھی غالب کے گہرے مراسم تھے۔ نوعمری کے زمانے میں وہ حصولِ تعلیم کے لیے دہلی آئے تو غالب سے فارسی پڑھی۔ شاعری میں ان کے شاگرد ہوئے۔ ناظم تخلص استاد ہی کا دیا ہوا تھا۔ زندگی کے آخری دس برسوں میں ریاست رام پور سے سو روپے ماہانہ ملتا تھا۔ اس مقررہ رقم کے علاوہ بھی وہاں سے کچھ نہ کچھ مدد ہوتی رہتی تھی۔ غالب نے دو بار رامپور میں قیام بھی کیا۔ دورانِ قیام سو روپے ماہانہ طعام کی مد میں دیا جاتا تھا۔

۳۔ سلطنت اودھ سے بھی غالب کا تعلق رہا۔ نواب واجد علی شاہ نے مدح گوئی کے صلے میں پانچ سو روپے سالانہ مقرر کیا مگر ان کی سلطنت دو سال بعد ختم ہو گئی۔ نصیر الدین حیدر کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر بھیجا۔ غالب کے بیان کے مطابق اس پر پانچ ہزار روپے بطور انعام عطا ہوئے جو درمیان کے لوگ کھا گئے۔

۴۔ غالبؔ نے ریاست حیدرآباد میں بھی رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شمس الامرا اور سالار جنگ اوّل کی مدح میں قصیدے کہے۔ یہ سراغ نہیں ملتا کہ ان قصیدوں کا صلہ انھیں ملا یا نہیں۔

۵۔ والیٔ ٹونک کی مدح میں دو قصیدے کہے اور صلہ پایا۔

۶۔ دیوانِ غالبؔ میں یہ شعر موجود ہے ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

تجمل حسین خاں فرخ آباد کے نواب تھے۔ غالبؔ کے ان سے اچھے مراسم تھے۔ اس ریاست سے وقتاً فوقتاً غالبؔ کو کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔

۷۔ ریاست الور کے راجاؤں کی طرف سے بھی غالب کی قدر دانی ہوئی لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی توقع سے کم تھی۔

۸۔ جے پور، گوالیار، پٹیالہ سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا رہا۔

یہ ذکر تو تھا حکومتوں اور ریاستوں کا۔ بہت سے صاحبِ دل رئیس بھی ان کے قدر دان تھے اور حسب حیثیت کچھ نہ کچھ نذر کرتے رہتے تھے۔

اسیری و رہائی

غالبؔ شطرنج اور چوسر کے شوقین تھے اور کھیل کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے روپے لگا کر کھیلتے تھے۔ اسی کو جوا کہتے ہیں۔ کوتوال شہر سے ان کی مخالفت تھی۔ اس نے موقعے کا فائدہ اٹھایا اور قمار بازی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ مجسٹریٹ نے چھ ماہ قید کی سزا سنائی۔ ججی میں اپیل کی گئی جو خارج ہو گئی۔ حکومت سے مدد کی درخواست کی گئی۔

بھی نامنظور ہوگئی۔ بادشاہِ وقت نے سفارش کی مگر وہ بھی قبول نہ ہوئی۔ آخر تین ماہ بعد مجسٹریٹ نے خود حکام بالا کو رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔

اس اسیری سے غالب بہت دل برداشتہ تھے کیوں کہ پورے شہر میں بلکہ باہر بھی خاصی رسوائی ہوئی تھی۔ موت کے آرزومند تھے اور ملک میں رہنا ناگوار تھا۔ تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:-

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہوگیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبّہ لگ گیا ہے۔"

اسیری کا یہ واقعہ ۱۸۴۷ء کا ہے۔

۱۸۵۷ء کی قیامت

انگریزوں نے آہستہ آہستہ سارے ملک میں قدم جما لیے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ دہلی کے لال قلعے میں تختِ شاہی پر بیٹھے ضرور تھے مگر بالکل بے بس اور بے اختیار۔ آخر کار ان کی برائے نام حکومت کے خاتمے کا زمانہ بھی آپہنچا۔ ۱۸۵۷ء میں فوجیوں نے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کر دی۔ رعایا کا بڑا حصّہ بھی غیر منظم طور پر اس میں شریک ہوگیا۔ بہت کشت و خون ہوا۔ زبردست بربادی ہوئی۔ آخر کار بغاوت ناکام ہوئی۔ شہزادے قتل کر دیے گئے۔ بہادر شاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ ہزاروں کی جائداد ضبط ہوئی۔ ہزارہا لوگوں نے سزائے موت پائی۔ غالب دہلی میں گوشہ نشین تھے مگر حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کے گھر کا سامان لٹا۔ ان کے بھائی یوسف کی

موت ہوئی تو ان کی تدفین بھی دشوار ہوئی۔ غرض اس زمانے میں غالب نے بہت سی مصیبتیں جھیلیں۔

آزادی کی اس پہلی جنگ کو جسے آگے چل کر غدر کا نام دیا گیا، غالب نے رست خیز بے جا کہا ہے۔ قیامت تو یہ بے شک تھی لیکن غالب نے اسے نامناسب قرار دیا ہے۔ اس زمانے کے جتنے حالات انھیں دستیاب ہوئے وہ ایک فارسی کتاب دستنبو میں محفوظ کر دیے ہیں۔ خطوط میں بھی بہت کچھ لکھ دیا ہے لیکن احتیاط سے کام لیا ہے۔ ایک خط میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ تفصیل لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں میں بہت سی اہم معلومات محفوظ ہو گئی ہیں۔ دستنبو تو ایک خاص مقصد کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس سے وہ انگریز حکام کو خوش کرنے کا کام لینا چاہتے تھے لیکن خطوں میں جا بجا حاکموں کے ظلم و زیادتی کا ذکر موجود ہے۔

غالب لکھتے ہیں کہ چار ماہ اور چار دن (۱۱ مئی تا ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء) دہلی پر باغیوں کا قبضہ رہا۔ اس دوران باغیوں نے شہر کو برباد کیا۔ جس پر انگریزوں کی مخبری کا شک ہوا اسے قتل کر دیا اور اس کا گھر لوٹ لیا۔ جیل خانوں کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ آخر باغیوں کو شکست ہوئی اور انگریز شہر پر قابض ہو گئے۔ یہاں سے ان کے مظالم کی داستان شروع ہوتی ہے۔ کوئی قاعدہ قانون باقی نہ رہا۔ جسے چاہا پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ بے گناہوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ دہلی کے رہنے والے شہر چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔ جو رہ گئے انھیں پانی تک میسر نہ تھا۔ رزق نایاب تھا۔ غالب کو سب سے زیادہ غم ان دوستوں کے مرنے

کا تھا جن میں کچھ انگریز تھے، کچھ ہندوستانی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کی زیست کیوں نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"

کئی خطوں میں لکھا ہے کہ مسلمان خاص طور پر برباد ہو گئے تھے۔ ہندوؤں کی ڈیوڑھیوں پر پرچم لہراتے تھے۔ مسلمانوں کے گھروں میں خاک اڑتی تھی۔ جو لوگ واپس آکر اپنے گھروں میں آباد ہونا چاہتے تھے انھیں ٹکٹ خریدنے پڑتے تھے۔

مالی مشکلات

غالب عیش و آرام اور شان و شوکت کی زندگی گزارنے کی آرزو رکھتے تھے لیکن ساری زندگی مالی مشکلات میں گھرے رہے۔ شروع سے قرض لینے کے عادی ہو گئے تھے اور سود ادا کرنے سے نہیں گھبراتے تھے۔ سود پر رقم قرض دینے کو مہاجن موجود تھے۔ کہیں سے رقم ملنے کی امید ہوئی اور انھوں نے قرض لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری زندگی پنپ نہیں سکے۔

قلعے سے جو ماہوار تنخواہ ملتی تھی اسے چھ ماہی کر دیا گیا تو ایک قطعے میں اس کی

شکایت کی ہے

میری تنخواہ جو مقرر ہے ۔۔۔ اس کے ملنے کا ہے عجیب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک ۔۔۔ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قیدِ حیات ۔۔۔ اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ۔۔۔ اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ۔۔۔ ہو گیا ہے شریک ساہوکار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ ۔۔۔ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تفتہ کے نام ایک خط سے غالب کی تنگ دستی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ قرض لینے کے کیسے عادی ہو گئے تھے۔ لکھتے ہیں :-

"تمھارا دعا گو اور امور میں عالی پایہ نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ عالی ہے یعنی محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور سے اگر دو ہزار ہاتھ آ جاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے سو میرے صرف میں آئیں گے۔ جھاجو کا سودی قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گا۔"

ایامِ غدر میں حالت زیادہ سقیم تھی۔ سامان لٹ گیا تھا۔ کہیں سے کچھ ملنے کی امید نہ تھی۔ اس زمانے میں پیٹ بھرنے کے لیے تن کے کپڑے تک بیچنے پڑے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں " لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں" یعنی

کپڑا بیچ کر گزر کرتا ہوں ۔ ایک خط میں پنجابی کہاوت کا استعمال کرتے ہیں کہ "پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں"۔

ان کے اپنے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہانہ خرچ کسی طرح تین سو روپے سے کم نہ تھا اور آمدنی خود ان کے ارشاد کے مطابق ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے تھی۔ گویا ایک سو چالیس روپے ماہوار کا خسارہ تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"جانتے ہو علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹی نہیں کھاتا۔ اس وقت کلّو (ملازم) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض ملنے کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل"۔

یہ تھیں وہ مالی مشکلات جن سے غالب کو ساری زندگی نبرد آزما ہونا پڑا لیکن انھوں نے ان تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

علالت

غالب کی عمر کا آخری حصّہ تکلیف دہ بیماریوں میں گزرا۔ طرح طرح کے امراض نے انھیں گھیر لیا تھا۔ صحت کی خرابی نے ایسا عاجز کر دیا تھا کہ کبھی کبھی تو موت کی دعا کرتے تھے۔ جوانی میں صحت قابلِ رشک تھی۔ چمپئی رنگ، کشیدہ قامت، مضبوط ہاتھ پاؤں اور داڑھی منڈی ہوئی۔ دیدہ ور تعریف کیے بغیر نہ رہتے تھے لیکن شراب نوشی کی کثرت اور ہجومِ آلام نے صحت برباد کر دی تھی۔

ایامِ غدر میں قولنج کا شدید حملہ ہوا مگر جانبر ہو گئے۔ اس کے چار سال

بعد دردِ سر میں مبتلا ہو گئے۔ ساتھ ہی سیدھے ہاتھ میں پھنسی نکلی جو پھوڑا بن گئی۔ پھوڑا ایک کر پھوٹا تو ایک غار سا بن گیا۔ ان دنوں اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ یہ سب فسادِ خون کا نتیجہ تھا۔ مرض بڑھا اور سارے جسم پر پھوڑے نکل آئے۔ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ رفعِ حاجت کے لیے پلنگ کے برابر حاجتی لگا دی گئی۔ پھر تسلسلِ بول کا عارضہ ہو گیا جس سے کمزوری میں اضافہ ہو گیا۔ وفات سے دو ڈھائی سال قبل خود ان کے اپنے لفظوں میں یہ حال تھا کہ" پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، اِن سب ضعفوں پر ضعفِ طالع"۔ پیشاب کی زیادتی کا سبب ذیابیطس کا مرض تھا۔ اسی کے سبب پنڈلیوں میں درد رہتا تھا اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ جو دوست احباب ملاقات یا مزاج پرسی کو آتے تھے ان کی بات سن نہ سکتے تھے۔ کسی کو کچھ عرض کرنا ہوتا تو کاغذ پر لکھ کر سامنے کر دیتا تھا۔ اپنا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات سے چند روز قبل بقولِ حالی یہ صورت ہو گئی تھی کہ بار بار بے ہوش ہو جاتے تھے۔ موت سے ایک دن پہلے علاء الدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے طبیعت کا حال دریافت کیا تھا۔ اِنھوں نے جواب میں لکھوایا:۔

" میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے

پوچھ لینا۔"

ایک بار تو انھوں نے ۱۲۷۷ھ میں اپنی موت کی پیش گوئی بھی کر دی تھی اور "غالب مُرد" سے اس کی تاریخ نکالی تھی۔ دوستوں کو لکھ دیا تھا کہ بس اب رخصت کا وقت آپہنچا ہے۔ آپ کے ہاتھ سے جو راحت پہنچنی ہے جلد پہنچ لے۔ یہی تاریخ نکالنے کا مدعا تھا۔ عالم الغیب تو خدا ہے۔ یہ سال گزر گیا تو کسی بے تکلف دوست نے لکھا کہ پچھلے سال تو وبا بھی پھیلی مگر آپ بحمداللہ سلامت رہے۔ ظرافت سے کام لیتے ہوئے لکھا کہ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔

وفات

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا مرض موت کا سبب بنا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ذیابیطس کی شدت نے ان کی جان لی۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء آخری ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو انتقال فرمایا۔ دہلی دروازے کے باہر جنازے کی نماز پڑھی گئی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے قریب ایک احاطے میں سپردِ خاک کیے گئے۔ میر مہدی مجروح نے قطعۂ تاریخ کہا جو لوحِ مزار پر کندہ کرا دیا گیا:-

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی، مجروح
ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہِ خاک

❖ ❖ ❖

حلیہ غالبؔ ایک وجیہ انسان تھے۔ قد و قامت، عادات و اطوار، رہن سہن ــــ ہر طرح وہ کسی بڑی ریاست کے نواب لگتے تھے۔ ایسی ہی زندگی گزارنا ان کی خواہش تھی۔ اسی خواہش کی تکمیل میں ساری زندگی سود دی قرض لیتے رہے اور مالی دشواریوں میں مبتلا رہے۔

ان کا قد لمبا، جسم چھریرا مگر توانا، ہاتھ پاؤں مضبوط اور رنگ گورا تھا۔ دلچسپ ظرافت آمیز گفتگو کرتے تھے۔ لب و لہجے میں متانت تھی۔ ان سب خوبیوں نے شخصیت کو بے حد پرکشش بنا دیا تھا۔ مولانا حالیؔ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے انھیں جوانی میں دیکھا تھا انھوں نے بتایا کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے خوبصورت اور پرکشش نوجوانوں میں گنے جاتے تھے۔ خود غالبؔ نے مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے نام ایک خط میں اپنی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے :۔

"تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا (مراد یہ کہ جوان تھا) تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔"

اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی میں داڑھی منڈاتے تھے۔ بال سفید ہونے لگے تو داڑھی رکھ لی۔ پہلے مسّی لگاتے تھے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے تو مسّی لگانی چھوڑ دی۔

لباس غالبؔ ایک خوش پوش انسان تھے۔ بیش قیمت لباس پسند کرتے تھے۔ پاجامہ، انگرکھا، اس کے اوپر فرغل یعنی چغہ اور

سر پر اونچی ٹوپی ۔ یہ تھا ان کا لباس۔

حالات کیسے بھی ہوں، کہیں کبھی جاتے تو سواری میں جاتے تھے۔

خوراک ہمیشہ نفیس کھانے پسند کرتے تھے۔ بڑھاپے میں خوراک کم ہوگئی تھی۔ خطوں میں جا بجا اس کی شکایت کی ہے لیکن یہ کم خوراک کبھی کچھ زیادہ کم نہ تھی۔ ناشتے کے وقت سات بادام کا شیرہ قند (شکر) کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی یعنی سوپ۔ بڑھاپے میں اس کی مقدار گھٹ کے چوتھائی رہ گئی تھی۔ قریب شام تین یا چار تلے ہوئے کباب۔ آم بہت مرغوب تھے۔

شراب رات کو پانچ روپے بھر (تقریباً پانچ تولے) عمدہ شراب اور اس کے ہم وزن عرقِ گلاب۔ یہ شراب کبھی خانہ ساز ہوتی تھی۔ لیکن انگریزی شراب کاسٹلین انھیں بہت پسند تھی۔ نمکین تلے ہوئے باداموں کے ساتھ شراب پیتے تھے۔ شراب کی بوتلیں توشہ خانے میں محفوظ رہتی تھیں

مطالعہ مطالعے کا غالب کو بہت شوق تھا۔ ایک بار بوستانِ خیال دستیاب ہوگئی۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ دن بھر اس کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ رات بھر شراب نوشی میں۔

کبھی کوئی کتاب خریدی نہیں۔ کتاب مستعار لیتے اور پڑھ کر واپس کر دیتے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں: دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا ۔۔۔ میں کتاب دیکھ لیتا ہوں۔ مول نہیں لیتا۔ دوستوں سے کتابیں منگائے

اور پڑھ کر لوٹا دیتے ۔ حافظہ ایسا پایا تھا کہ جو ایک بار پڑھ لیا یاد ہو گیا ۔ ایک اور بات یہ کہ ذرا سے غور و فکر سے کتاب کے مطالب ان پر پوری طرح واضح ہو جاتے تھے ۔

تصانیف غالبؔ نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بیش قیمت تصانیف چھوڑیں ۔ یہاں اختصار کے ساتھ ان تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے

۱۔ **اردو کلام** ــــ کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے ۔ ابتدا میں خاص طور پر طبیعت مشکل گوئی کی طرف مائل تھی ۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ اسے کم پسند کیا جائے گا ۔ دوستوں کے مشورے پر انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب کیا ۔ مشکل کلام میں سے کچھ حصّہ نمونے کے طور پر رہنے دیا ۔ باقی کو خارج کر دیا ۔ ان کی زندگی میں دیوان کے جتنے اڈیشن شایع ہوئے ان میں یہ منسوخ کلام موجود نہیں لیکن یہ ضایع ہونے سے بچ گیا اور بعد کو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شایع ہوا ۔

۲۔ **خطوط** ــــ اردو خطوں کو بار بار مرتب کیا گیا ۔ کچھ خطوط تو ان کی زندگی میں ہی شایع ہو گئے تھے ۔ ان کی وفات کے بعد ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے خطوط جمع کیے گئے اور سلیقے کے ساتھ انھیں شایع کیا گیا ۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ۔

۳۔ **فارسی** کا جملہ سرمایہ کلیاتِ نظم فارسی اور کلیاتِ نثر فارسی میں یکجا ہو گیا ہے ۔ کلیاتِ نثر میں پنج آہنگ ، مہرِ نیم روز اور دستنبو شامل ہیں ۔

۴۔ قاطع برہان (جو ان کی زندگی میں دوسری بار درفش کاویانی کے نام

سے شایع ہوئی۔) سبد چیں (فارسی کا باقی ماندہ کلام)، تیغ تیز، نکات و رقعاتِ غالب (فارسی)، مثنوی ابرِ گہربار اور گلِ رعنا (اردو فارسی کلام کا انتخاب) ان کی دیگر تصانیف ہیں۔

دریا دلی

غالب بہت فیاض اور دریا دل واقع ہوئے تھے۔ دوست احباب طرح طرح کی فرمایشیں کرتے تھے اور بقول مولانا حالی انھیں یہ فرمایشیں گراں نہ گزرتی تھیں اور بہرحال انھیں پورا کرتے تھے۔ گھر کے سامنے اپاہج اور محتاج جمع رہتے تھے اور ان کی ہر طرح مدد کی جاتی تھی۔ ان کے ملازمین کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ تنگ دستی کے دنوں میں کبھی انھیں برطرف نہیں کیا۔ کوئی نوکری چھوڑ گیا تو اسے روکا نہیں۔ کوئی لوٹ آیا تو اسے بہرحال پناہ دی کہ بھائی جہاں سے ہم کھائیں وہاں سے تم بھی کھاؤ۔

مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں دو دلچسپ واقعات تحریر کیے ہیں جنھیں یہاں دہرایا جاتا ہے۔

غدر کے فرو ہو جانے کے بعد لفٹنٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقومِ جواہر کے عطا ہوا۔ دستور کے مطابق چپراسی جمعدار وغیرہ انعام لینے کے لیے حاضر ہوئے۔ انھیں ایک علیحدہ مکان میں بٹھا لیا گیا۔ غالب جانتے تھے کہ انعام تو بہرحال دینا ہوگا اور اس کے لیے کچھ موجود نہ تھا۔ انھوں نے خلعت و جواہر کو پہلے ہی فروخت کے لیے بازار بھیج دیا تھا۔ جب بازار سے رقم آگئی تو ان لوگوں کو انعام دے دیا گیا۔

ایک دولت مند دوست غالب سے ملنے آئے۔ چھینٹ کا فرغل (چغہ)

پہنے ہوئے تھے کیوں کہ اب حالات اچھے نہیں رہے تھے۔ غالبؔ نے جھینٹ کی بہت تعریف کی اور ایسا ہی کپڑا فراہم کرنے کی فرمایش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ اتنا ہی پسند ہے تو لے لیجیے۔ کہنے لگے ہاں جی تو یہی چاہتا تھا مگر آپ کیا پہن کر جائیں گے۔ لیجیے میرا فرغل حاضر ہے۔ اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے ان کا معمولی فرغل لے کر بیش قیمت فرغل انھیں پیش کر دیا۔

دوست نوازی

غالبؔ اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ طرح طرح ان کی دلداری اور دلجوئی کرتے تھے۔ فرغل کے واقعے سے بھی ان کی دوست نوازی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"دنیا دار نہیں فقیر خاکسار ہوں۔ تواضع میری خو ہے۔ انجاحِ مقاصدِ خلق میں کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔"

سوانحِ غالبؔ کا بغور مطالعہ کیجیے تو قدم قدم پر ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے غالبؔ کی دوست نوازی کا ثبوت ملتا ہے۔ منشی شیو نرائن آرامؔ نے معیار الشعراء کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا۔ امیر مینائی نے بغرضِ اشاعت اپنا کلام اس رسالے کو بھیجا۔ آرامؔ نے امیرؔ کا کلام تو نہیں چھاپا اپنا بیان چھاپ دیا کہ جب تک ہمیں اس شاعر کا نام اور حالات معلوم نہ ہوں ہم کلام نہیں چھاپ سکتے۔ غالبؔ نے فوراً امیر مینائی کے حالات لکھے، ان کی غزلیں بھیجیں اور لکھا کہ یہ میرے دوست ہیں، اِن کا کلام شایع کرو۔

غالبؔ اپنے دوستوں کا کام نکالنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر ان کی سفارشیں کرتے تھے مصیبت پڑنے پر خط لکھ کر دلجوئی

کرتے تھے۔ دوستوں پر جان تو چھڑکتے ہی تھے۔ دولت ہوتی تو اسے بھی دوستوں پر نچھاور کرنے سے ہرگز نہ چوکتے۔

انسان دوستی

وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ کسی کی تکلیف ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ مبتلائے الم کوئی ہو تڑپ رہ جاتے تھے۔ اس میں نہ اپنے پرائے کی تخصیص تھی، نہ گورے کالے کی تمیز اور نہ ہندو مسلمان کا فرق۔ انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ میں ہندو مسلمان، عیسائی سب کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ کالوں کے ہاتھوں گورے مارے گئے تو اس پر آنسو بہائے کہ ان میں کوئی دوست تھا تو کوئی محسن۔ کالوں کی موت کا ماتم کیوں نہ کرتے۔ ان میں دوست، عزیز، شاگرد، معشوق سبھی شامل تھے۔

بہادر شاہ کو قیدی بنا کر رنگون بھیج دیا گیا، شہزادے قتل کر دیے گئے، بیگماتِ قلعہ دربدر ہوگئیں، بوڑھی عورتیں کٹنیاں اور نوجوان لڑکیاں کسبیاں بننے پر مجبور کر دی گئیں۔ واجد علی شاہ اور ان کے متعلقین غیروں کے دست نگر ہوگئے۔ بے گناہ انگریز عورتیں اور ان کے معصوم بچے تہِ تیغ کر دیے گئے۔ ان سب حادثات نے ایک درد مند شاعر کے دل کو تڑپا دیا۔ سب کی تباہی و بربادی پر وہ یکساں ملول ہوئے۔

غالب کی شخصیت کا یہ پہلو کہ ہر انسان کا دکھ درد ان کا اپنا دکھ درد ہے۔ ان کے نزدیک کوئی پرایا نہیں، سب ان کے اپنے ہیں، بڑی جاذبیت رکھتا ہے۔

مذہبی عقائد

غالب کے مذہبی عقائد کا معاملہ بھی خاصا پیچیدہ اور دلچسپ ہے۔ ان کے آبا و اجداد سنی تھے لیکن غالب نے ایک دو خطوں میں اپنے اثنا عشری ہونے کا ذکر کیا ہے مگر ان کے اس بیان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ مخاطب کو خوش کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ بہادر شاہ نے پوچھا مرزا نوشہ ہم نے سنا ہے تم رافضی ہو تو ایک رباعی میں جواب دیا کہ میں صوفی مشرب ماوراء النہر کا رہنے والا رافضی کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ کسی شیعہ نے عقائد کے بارے میں سوال کیا تو لکھ دیا کہ علی کا غلام اور بندۂ اثنا عشری ہوں۔ ہر فقرے کے بعد بارہ کا ہندسہ لکھتا ہوں مگر یہ بارہ کا ہندسہ ہر عبارت میں نظر نہ آئے گا۔

ان کے زمانے میں یہ بحث چلی کہ خدا جو قادر مطلق ہے اگر چاہے تو محمدؐ جیسا دوسرا پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ غالب کا عقیدہ تھا کہ خدا سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔ یہ خیال ایک مثنوی (دمغ الباطل) میں پیش کیا۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی نے یہ اشعار سنے تو گلہ کیا تم نے تو ہمارے عقائد کے خلاف لکھ دیا۔ انھوں نے فوراً اور شعر کہہ کر مثنوی میں داخل کیے کہ غالب تو کچھ دیوانہ سودائی ہو گیا ہے جو یہ بکتا ہے۔ خدا تعالیٰ ایسا کرنے ہی کیوں لگا۔

غالب دراصل ایک کھلے ذہن کے انسان تھے۔ انسانیت ہی ان کا مذہب تھا۔ کسی مسلک اور کسی عقیدے سے نفرت نہ تھی۔ دوستوں کا حلقہ وسیع تھا اور اس میں سنی، شیعہ، ہندو، مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے۔ خود ان کے الفاظ میں وہ سب کو اپنا بھائی خیال کرتے تھے اور سب کی

دل جوئی و دل آسائی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کے مذہبی عقاید کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھتے تھے، رسولؐ اور آل رسولؐ سے گہری عقیدت تھی، حضرت علی سے والہانہ عشق تھا، جملہ مذاہب کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

حیاتِ معاشقہ

غالبؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی دشواریوں میں گزرا۔ آخری ایام فکرِ معاش کے علاوہ بیماری کی اذیت میں گزرے لیکن اس کے وافر ثبوت موجود ہیں کہ جوانی رنگ رلیوں میں بسر ہوئی۔ مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ہے کہ ایک طوائف مغل جان سے اکثر پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اسی خط میں اپنے مرشد کامل کی یہ رائے بھی دہرائی ہے کہ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔

ایک دوست کی محبوبہ وفات پاگئی تو اسے پرسہ دینے کے بعد اپنے بارے میں لکھا:-

"مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اسی کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآں کہ یہ کوچہ چھوٹ گیا، اس فن میں بے گانۂ محض ہوگیا ہوں لیکن اب بھی

کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

اس کی موت پر غالب نے ایک غزل میں اس کا ماتم کیا۔ ملاحظہ فرمائیے یہ اشعار ؎

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

⁂ ⁂ ⁂

غالب ایک عظیم فن کار ہی نہیں، ایک رنگا رنگ، پہلو دار شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ ان کے کلام سے مسرت کے سوا بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان کے خطوط اردو نثر کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہیں۔ ان کے کلام اور ان کے خطوط دونوں کا مطالعہ اردو ادب کے طالب علم کے لیے ناگزیر ہے لیکن ان کی زندگی کی کتاب بھی توجہ چاہتی ہے۔ یہ مزے دار بھی ہے، ولولہ انگیز بھی اور مرقعِ عبرت بھی۔ اسے چند صفحوں میں سمیٹ لینا ہمارے بس کی بات تو ہے نہیں۔ صرف اہم باتیں یہاں مختصراً بیان کر دی گئیں۔ کسی دل میں حیاتِ غالب کے مطالعے کا شوق بیدار ہو تو اب اس موضوع پر کئی کتابیں دستیاب ہیں۔

غالبؔ — شاعر

ہر دور میں دو چار ایسے فن کار ضرور ہوتے ہیں جن کے ہم عصر ان کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے مگر وہ خود جانتے ہیں کہ آج نہیں تو کل ان کی قدر ہو کے رہے گی اور اہلِ نظر ان کی تخلیقات کو سر آنکھوں پر رکھیں گے۔ انگریز شاعر کیٹس ایک ہونہار نوجوان تھا۔ پیشے کے لحاظ سے کمپاؤنڈر تھا۔ شعر گوئی پر مائل ہوا تو لافانی نظمیں تخلیق کیں۔ ادنیٰ درجے کے شاعروں کو ایک نوجوان کا اپنے میدان میں یوں دندناتے ہوئے گھس آنا گوارا نہ ہوا۔ سخت نکتہ چینی کی۔ کلام میں طرح طرح کے عیب ڈھونڈ نکالے اور فرمایا کمپاؤنڈر صاحب آپ کی نظموں سے دواؤں کی بو آتی ہے۔ آپ اپنی دنیا میں لوٹ جائیے اور مرہم پٹی کیجیے بلیز! اس کا دل ٹوٹ گیا۔ دق ہو گئی۔ خون تھوکنے لگا۔ مٹی کے مٹی میں مل جانے کا وقت قریب آ پہنچا تو ماں کو لکھا۔ میڈم! ایک دن انگریزی کے عظیم شاعروں میں میرا شمار ہوگا۔ شیکسپیر اور ملٹن کے ساتھ میرا نام لیا جائے گا مگر میرے مرنے کے بعد۔ ہوا بھی یہی۔

ہمارے اس عظیم شاعر غالب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور انھوں نے بھی فارسی کے ایک شعر میں کہا کہ دنیا میں میری شہرت میرے مرنے کے بعد ہوگی۔ (شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن) ۱۳ر فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں علاء الدین احمد خاں علائی کو لکھتے ہیں۔ "مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد جیسی چاہیے ویسی پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا۔" ایک قطعے میں بھی یہی شکایت کی ہے۔

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

انھیں ساری زندگی گلہ رہا کہ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی۔ اس ناقدری کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر شاعری کی۔ ان کا کلام توجہ چاہتا تھا۔ غور و فکر کا تقاضا کرتا تھا۔ اس لیے ان کے کلام کو سمجھنا اور سراہنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی رائے ہے کہ اگر کوئی شاعر سامعین کی بڑی تعداد کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل نہیں بلکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ پچھلے شعراء کے خیالات لفظوں کے معمولی رد و بدل کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ نئی بات کو سمجھنے اور اس

سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت اور توجہ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
بڑا شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نزدیک وہ ہے جس کے سامعین کا حلقہ خواہ شروع میں کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو لیکن دھیرے دھیرے پھیلتا اور بڑھتا جائے، اس کے قدر دان ہر زمانے میں موجود ہوں بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے۔ ذوقؔ شعر سناتے تھے تو داد وتحسین کا غلغلہ بلند ہوتا تھا۔ غالبؔ کا کلام سن کے لوگ سر کھجانے لگتے تھے۔ کوئی سمجھتا تھا، کوئی نہ سمجھتا تھا۔ غالبؔ کو اپنے شعروں کی شرح اپنے خطوں میں کرنی پڑتی تھی۔ پھر بھی کسی کو ان کا کلام مشکل نظر آتا تھا تو کسی کو مہمل۔

آخر رفتہ رفتہ ان کی شاعری کو سمجھنے والوں کا ایک مختصر سا حلقہ پیدا ہوا اور ان کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ مرنے کے بعد غالبؔ کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ تو ہمارے پیش نظر ہے لیکن ان کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی ان کے قدر دان ملک کے گوشے گوشے میں موجود تھے۔ اس کے برخلاف ذوقؔ کی شہرت آزادؔ کی جادو بیانی کے باوجود دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

غالبؔ کو اپنی عظمت کا احساس تھا اور اپنے قلم کی گہرباری کا پوری طرح اندازہ تھا۔ نظم ونثر میں وہ کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "خدا کے واسطے داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر ومرزا کیا کہتے تھے۔ اگر ریختہ وہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟"

یہی مضمون شعروں کے پیکر میں ڈھلا تو ان لفظوں میں ادا ہوا ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں   شاعرِ نغز گوے وخوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

عبدالرحمٰن بجنوری نے غالبؔ کی عظمت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ـــــ وید مقدس اور دیوانِ غالبؔ۔"

آج غالبؔ کی شہرت ہندوستان تک ہی محدود نہیں۔ ساری دنیا ان کی عظمت کی قائل ہے۔ شاید کوئی ملک ایسا نہ ہو جہاں کے ادب نواز اور صاحبِ نظر ان کے نام سے ناواقف ہوں۔ آئیے اب ادب کے طالب علم کی حیثیت سے یہ غور کریں کہ غالبؔ کی اس عالمگیر شہرت و مقبولیت کا راز آخر ہے کیا اور وہ کون سی خصوصیات ہیں جنھیں کلامِ غالبؔ کی عظمت کا سرچشمہ کہا جا سکے۔

کلامِ غالبؔ کی اہم خصوصیات

جس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی جا رہی ہے وہ نہایت مشکل اور خاصا پیچیدہ ہے۔ اس کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے مختصر مضمون کی نہیں ضخیم کتاب کی ضرورت ہے پھر بھی یہاں ان چند خصوصیات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جن سے کلامِ غالبؔ کی شناخت ممکن ہے۔

جدّت پسندی

غالبؔ ایک خط میں لکھتے ہیں : "بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔" اور ان کا یہ مزاج تھا جدّت پسندی یعنی روشِ عام سے ہٹ کر چلنا۔ اسی میں ان کی انفرادیت کا راز پوشیدہ ہے اور یہی ان کی شاعری کا وصفِ خاص ہے۔ وہ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ ہر میدان میں اپنا رستہ آپ نکالنے کے عادی تھے۔ اپنی شعری روایت کو انھوں نے من وعن قبول نہیں کیا۔ اس کا جو حصّہ انھیں پسند نہ آیا بلاتامل اسے رد کر دیا۔ پامال راہوں پر چلنا انھوں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ وہ جانتے تھے خلقت کی پیروی کرنے والے راستہ بھٹک کر منزل سے دور ہو جاتے ہیں اس لیے اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ کارواں جس راستے پر روانہ ہوا ہے اس سے بچ کر چلو ؂

ازاں کہ پیرویِ خلق گمرہی آرد
نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتہ ست

مردہ پرستی سے انھیں نفرت ہے۔ ایک جگہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اگلے زمانے میں احمق نہ ہوتے تھے۔

غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ کوئی پامال مضمون ادا کرتے ہیں یا کوئی ایسا خیال دہراتے ہیں جسے پچھلا شاعر ادا کر چکا ہے تب بھی اس پر اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ غالبؔ کی اس خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے جناب مجنوںؔ گورکھپوری نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ غالب صاحبِ ہنر تھے۔ قدرت نے انھیں تخلیقی توانائی عطا کی تھی۔ ایسا خلاق ذہن جب مستعمل

طریقوں کو از سرِ نو استعمال کرتا ہے تو ان میں اپنی انفرادی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کی تقلید کبھی اجتہاد کا انداز لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ان کے اشعار پر کسی دوسرے شاعر کے کلام کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ وہ پامال اور فرسودہ محاورات اور عام بول چال سے اجتناب کرتے تھے۔ کبھی استعمال کرتے بھی تھے تو ان میں ایک جمالیاتی کیفیت اور فکری اشاریت پیدا کر دیتے تھے جس سے ندرت و تازگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ثبوت میں ان کے سارے اردو خطوط اور وہ غزلیں اور اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو سادگی و بے تکلفی میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور جن کا لہجہ و تیور صاف بتاتے ہیں کہ وہ غالبؔ ہی کے کہے ہوئے ہیں اور غالب کے سوا ایسے اشعار کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا تھا۔

انفرادیت ہمیشہ جدّت پسندی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ جدّت پسندی غالب کے مزاج کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے

وسعتِ مضامین

غالب سے پہلے اردو شاعری ایک محدود دائرے میں قید تھی۔ مولانا حالؔی نے ہماری شاعری پر جو سخت اعتراض کیے ہیں وہ دراصل غالب سے پہلے کی شاعری پر وارد ہوتے ہیں۔ غالب نے اردو شاعری کو اس تنگنائے سے باہر نکالا اور اسے وسعت عطا کی۔ جس شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس میں عشق و عاشقی کے مضامین کے سوا کچھ بھی نہیں اس میں پوری زندگی اور اس کے تمام مسائل کو سمو دیا۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ

" لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں

حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں
بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں؟"

غالب پوری زندگی کے شاعر ہیں یہ دعویٰ دلیل چاہتا ہے۔ اس کے لیے سات شعروں کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

۲۔ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

۳۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

۴۔ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

۵۔ پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

۶۔ یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

۷۔ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غزل کا مطلع بہت دلکش ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہم اپنے محبوب کی

جدائی میں آہیں بھر رہے ہیں۔ بے شک آہ میں اثر ہوتا ہے مگر مدتوں کے بعد ہوتا ہے۔ جب اثر ہوگا اور میرا محبوب بن سنور کے مجھ سے ملنے آئے گا اس وقت تک تو میں خاک میں مل چکا ہوں گا۔ اس شعر کا موضوع عشق ہے۔

• دوسرا شعر فلسفیانہ ہے۔ کہا جاتا ہے موسم کی پہلی برسات کا قطرہ صدف (سیپی) کے منھ میں پہنچ کر موتی بن جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ دریا کی ایک ایک لہر میں سو سو نہنگ (مگرمچھ) منھ کھولے ہوئے ہیں۔ یہ قطرہ صدف کے بجائے نہنگ کے منھ میں گرا تو اس کی خوراک بن جائے گا اور آخر کار برباد ہو جائے گا۔ اسی کا زیادہ اندیشہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان جب جنم لیتا ہے اس وقت اچھا ماحول نصیب ہو جائے تو جوہر قابل بن جاتا ہے۔ سازگار ماحول میسّر نہ آئے تو برباد ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت بیان کی گئی ہے۔

• اور اب تیسرا شعر۔ عشق سچا ہو تو محبوب کچے دھاگے میں بندھا ہوا کھنچا چلا آتا ہے۔ مگر اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ادھر معاملہ یہ ہے کہ تمنا بے تاب ہے کہ کسی طرح محبوب کا وصال میسّر ہو۔ وصال کی ساعت آنے تک تو جگر خون ہو کے بہ چکا ہوگا۔ اس شعر کا موضوع عشق ہے۔

• چوتھے شعر کا موضوع بھی عشق ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب، مجھے یقین ہے کہ تمھیں میری حالت کے بگڑنے کی خبر ملے گی تو بلا تاخیر چلے آؤ گے لیکن ہر طرف تو میرے بدخواہ ہیں۔ لوگ میری جاں کنی کی اطلاع تم تک پہنچانے میں اتنی دیر لگا دیں گے کہ میں اس وقت تک مر کے خاک میں مل چکا ہوں گا۔

• پانچویں شعر میں تصوف کا یہ مسئلہ بیان ہوا ہے کہ محبوبِ حقیقی کی نگاہِ

التفات عشق کو اس کی اپنی ذات سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ خود کو بھول جاتا ہے اور اپنے محبوب کی ذات میں جذب ہو جاتا ہے جیسا کہ مشہور صوفی منصور کے ساتھ ہوا کہ میں اور تو کا فرق مٹ گیا اور انا الحق کہہ بیٹھے۔

چھٹے شعر میں ارشاد ہوا ہے کہ زندگی کا وقفہ بے حد مختصر ہے اتنا مختصر جتنی دیر میں پلک جھپکتی ہے یا شعلہ بھڑک کر بجھتا ہے۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری کا موثر انداز میں بیان ہوا ہے۔

● مقطعے میں کہا گیا ہے کہ انسان کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے مرتے دم تک ان سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ شمع صبح ہونے تک جلتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان زندگی کے آخری لمحے تک آلام و مصائب میں گھرا رہتا ہے۔

دیکھا آپ نے سات شعروں کی اس غزل میں زندگی کا کون سا مسئلہ ہے جو بیان نہیں ہو گیا۔ پہلے تیسرے اور چوتھے شعر کا موضوع ہے عشق۔ دوسرے شعر میں انسانی زندگی پر ماحول کی کارفرمائی بیان ہوئی ہے۔ پانچویں شعر کا موضوع ہے تصوف۔ چھٹے شعر میں زندگی کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ مقطعے میں کہا گیا ہے کہ ساری زندگی غموں سے نجات ممکن نہیں۔

غالب نے زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا اور ہر رنگ میں دیکھا۔ ان کی اپنی زندگی طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزری۔ کبھی ان کا دامن خوشیوں سے بھر گیا تو کبھی چاروں طرف سے آلام و مصائب اس طرح گھر کے آئے جیسے ٹڈی دل آتا ہے۔ یہ ساری کیفیتیں ان کے شعروں میں بڑی شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ بیان ہو گئی ہیں۔ انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ

ہزاروں آدمی میری نظر سے گزرے ہیں۔ وہ فطرتِ انسانی کے نبض شناس تھے۔ جس سے ملے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اس تجربے سے بھی ان کی شاعری کو فائدہ پہنچا اور اس میں وسعت پیدا ہوئی۔

جن نقادوں کو غالب کے کلام کی وسعت کا دعویٰ ہے ان میں سے بعض تو حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ مثلاً غالب کے اس مصرعے سے کہ "دلوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم" یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ترقی پسند تھے اور محنت کشوں کے حامی و ہمدرد تھے۔ اس رائے میں تو صداقت نظر نہیں آتی لیکن غالب کی انسان دوستی سے کون انکار کر سکتا ہے۔

غرض یہ حقیقت ہے کہ غالب نے اردو غزل کو عشق و عاشقی کے گھٹے ہوئے ماحول سے نکالا، کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا اور اسے پوری زندگی کا ترجمان بنا دیا۔

عشقیہ شاعری

غالب غزل کے شاعر ہیں اور غزل داخلی صنفِ سخن ہے۔ دل پر گزری ہوئی واردات اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے اور عشق وہ واردات ہے جو ہر دل پر کبھی نہ کبھی گزر کے رہتی ہے۔ غزل کے شاعر کا اس موضوع پر مائل ہونا بالکل فطری بات ہے۔ غزل کا قاری بھی سب سے زیادہ اسی سے متاثر ہوتا ہے کیوں کہ وہ بھی عموماً اس منزل سے گزر چکا ہوتا ہے۔ اس لیے شاعر کی آپ بیتی اسے اپنی آپ بیتی لگتی ہے۔ درست کہا گیا ہے کہ غزل کا شاعر آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے۔

جو جتنا زیادہ حسن شناس ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ حسن پرست ہوگا اور

حسن پرستی کا ہی دوسرا نام عشق ہے۔ غالب کی رگوں میں جس نسل کا خون گردش کر رہا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر حسن پرست تھی۔ غالب کو جو ماحول ملا اس میں بھی اس کا بول بالا تھا اور اس حد تک تھا کہ جب پردے کی سختی کے سبب عورت کا دیدار محال تھا تو حسن کے شیدائی امرد پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ خود غالب کی جوانی رنگ رلیوں میں گزری۔ ان کے مکاتیب اس کے شاہد ہیں۔ کئی نازنینوں سے ان کی شناسائی تھی اور خود ان کے الفاظ میں "پہروں اختلاط رہتا تھا۔"

غالب نے شعر کہنے شروع کیے تو لامحالہ حسن و عشق ہی ان کا خاص موضوع تھا۔ فارسی کی عشقیہ شاعری ان کے پیشِ نظر تھی اور اسی کے زیرِ سایہ اردو کی عشقیہ شاعری نے جنم لیا تھا۔ یہ عشقیہ شاعری ایک خاص انداز کی تھی۔ اسے عشق کا روایتی تصور کہا جا سکتا ہے۔ لفظوں میں اس کی تصویر بنائی جائے تو وہ کچھ اس طرح ہوگی ـــــ کوئی نازنین ہے جس کا حسن توبہ شکن ہے۔ اس حسن کے ساتھ غرور بھی بے پناہ ہے۔ وہ کسی کو کیوں خاطر میں لائے۔ کوئی قسمت کا مارا پہلی ہی نظر میں اس کی زلف کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک نگہِ التفات کے بدلے اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ ہے مگر ادھر سے قطعاً بے نیازی ہے۔ محبت کا روگ عاشق کو گھلا گھلا کر مار ڈالتا ہے۔ وہاں اس پر کبھی اثر نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد بھی اسے پامال کیا جاتا ہے۔ اس کی روح سب کچھ دیکھتی ہے مگر اف نہیں کرتی ـــــ تو جناب، یہ ہے عشق کا روایتی تصور۔ جس میں محبوب سراپا ناز ہے اور عاشق سراپا نیاز!

غالب کی ابتدائی دور کی شاعری میں عشق کا یہی روایتی انداز نمایاں ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہمارا یہ عظیم شاعر اسی پامال راہ پر چلتا رہتا۔ اس نے عشق کی اس فرضی اور خیالی دنیا سے باہر قدم نکالا۔ اس میں اصلیت و واقعیت کا رنگ بھرا اور عشق کی ایک قابلِ یقین تصویر پیش کر دی۔ عشق کی تصویر میں واقعیت کا رنگ غالب سے پہلے میر بھر چکے تھے مگر ان کے یہاں محبوب کے ادب و احترام کا یہ عالم ہے کہ جیتے جی تو محبوب کے نزدیک آنے کی جرأت کیسے کرتے، مرنے کے بعد جب خاک ہو گئے تو بھی یہ احتیاط برقرار رہی کہ کہیں ان کے نزدیک نہ پہنچ جاؤں۔ خاک کا اپنے اوپر اختیار کہاں ہوتا ہے۔ ہوا جدھر اڑا لے گئی اڑ گئی گر یہاں یہ حال ہے کہ :-

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہ تھا پاسِ ادب ! غالب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ ادب احترام کے قائل نہیں۔ کبھی کبھی ہاتھا پائی پر اتر آتے ہیں :-

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

دراصل غالب کا تصورِ عشق فرضی نہیں اصلی ہے۔ انھیں اس تجربے سے گزرنے کا بھی موقع ملا۔ انھوں نے ایک خط میں ایک ڈومنی سے عشق کا صاف صاف ذکر کیا ہے۔ اس کی موت پر غالب نے ایک پر درد مرثیہ بھی لکھا ہے۔ چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں :-

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

میر افلاطونی عشق کے قائل ہیں۔ وہ محبوب کے بدن کا تصور کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں اسے چھو لینا تو درکنار۔ وصال ان کے نزدیک محبت کی موت ہے۔ فراقِ یار میں تڑپتے رہنا، رات کو رو رو کے سحر کرنا، دن کو جدائی میں جوں توں شام کرنا، اس کی محفل میں حرفِ مدعا زبان پر لائے بغیر صورتِ تصویر حیب حجاب پہروں کھڑے رہنا ہی ان کے لیے حاصلِ حیات ہے۔ غالب کا تصورِ عشق اس سے مختلف ہے۔ شاعری کے علاوہ خطوں میں انھوں نے جو کچھ صاف صاف کہا ہے اس سے غالب کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مرشدِ کامل نے نصیحت کی تھی کہ کھاؤ پیو، مزے اڑاؤ، مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ مطلب یہ کہ کسی ایک کی زلف کے اسیر ہوکے نہ رہ جاؤ۔ ایک دوست کی معشوقہ کے انتقال کی خبر سن کے لکھتے ہیں کہ شکر بجالاؤ کہ اسیری سے رہائی ملی اور اگر گرفتاری سے ایسے ہی خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ پھر اپنی مثال دیتے ہیں کہ ہمیں دیکھو کہ ایک اگلے پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ بے شک بہت سی باتیں وہ محض ہنسنے ہنسانے کے لیے لکھتے تھے لیکن ماننا پڑے گا کہ ان تحریروں سے ان کے ذہن کو سمجھنے میں کسی نہ کسی حد تک مدد ضرور ملتی ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں: "میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔"

"غالب ـــ شاعر" کا معاملہ "غالب ـــ مکتوب نگار" سے زیادہ مختلف نہیں۔ یہاں بھی وہ مطلب برآری پر مائل نظر آتے ہیں۔ ہجر سے لذت یاب نہیں ہوتے، وصل کے طلب گار ہیں۔ محبوب سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ :۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

یہ دھمکی بھی انھی کی زبان سے ادا ہوئی ہے کہ :۔

ہم سے کھُل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

خوشامد سے کام نہ بنے تو انھیں اور بھی کئی گر یاد ہیں :۔

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

غالب کی عشقیہ شاعری کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ان کا محبوب کسی خیالی دنیا کا حسین نہیں، اصلی دنیا کا گوشت پوست کا انسان ہے۔ اس میں کمزوریاں بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ حورِ بہشتی کی طرح بے مثال ہو۔ اس کا حسن بناؤ سنگھار کا محتاج ہے۔ (دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا)۔ ایسی بات بھی نہیں کہ اس کی پاک دامنی کی قسم کھائی جا سکے۔ وہ گھُل بھی جاتا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے :۔

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

وہ انسانی کمزوریاں رکھتا ہے تو عاشق بھی فرشتہ نہیں۔ وہ بھی اس کی نگہِ التفات کا طلبگار ہے، اس کے وصال کا آرزو مند ہے۔ کہتا ہے :۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

شوخی و ظرافت جو غالب کے مزاج کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ ان کی

عشقیہ شاعری میں کبھی نظر آتی ہے۔ کبھی محبوب کو چھیڑتے اور گڑگڑاتے ہیں، کبھی خود پر چوٹ کرتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے :۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو   اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم اگر پڑا پایا   دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

اور دیکھیے خود اپنا کارٹون کیسا مضحکہ خیز بناتے ہیں :۔

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اور اس مضحکہ تصویر کا جواب تو ناپید ہے کہ :۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

محبوب سے چھیڑ چھاڑ کا سبب یہ ہے کہ وہ اسے کوئی آسمانی مخلوق نہیں مانتے۔ میر کی طرح اس کی پرستش نہیں کرتے۔ اس سے برابری کا تعلق

رکھتے ہیں۔ ان کا مشہور شعر ہے :۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

غرض یہ کہ غالب کا تصورِ عشق ارضی ہے۔ وہ افلاطونی عشق کے قائل نہیں۔ وصال کی خواہش رکھتے ہیں۔ جرأت کی معاملہ بندی غالب کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ غالب کی خواہشِ وصل پر ہوس کا گمان نہیں گزرتا۔ اخلاق کی مشرقی اقدار کو وہ کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتے۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے عبادت بریلوی لکھتے ہیں :۔

"غالب کے تصورِ عشق کی نوعیت اس میں شبہ نہیں کہ جنسی ہے لیکن یہ جرأت، انشا اور رنگین کے تصورِ عشق سے مختلف ہے۔ غالب کے یہاں یہ نظریۂ عشق کہیں کبھی ایک ذہنی تعیش کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ ابتذال کے عناصر کبھی اس میں پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جرأت کی طرح معاملہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ جنسی معاملات کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں بڑی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور لیے دیے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عشق و ہوس میں امتیاز کرتے ہیں۔"

دیوانِ غالب کی ورق گردانی کیجیے تو جا بجا حسن کی دلکش تصویریں اور عشق کی لطیف و نازک کیفیتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں :۔

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ ہم جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں پھر تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

غالب کی عشقیہ شاعری میں کئی ایسے مضامین نظر آتے ہیں جو انھیں بے حد مرغوب ہیں اور جنھیں وہ بار بار دہراتے ہیں اور ہر بار نیا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ ان میں ایک مضمون رشک کا ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ انھیں خود اپنی ذات پر رشک آتا ہے۔ انھیں یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ خود اپنے محبوب کو دیکھ سکیں :۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

رخصت کے وقت وہ اپنے محبوب کو خدا حافظ کہنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ بھلا اپنے محبوب کو خدا کے حوالے کیسے کر دوں مگر ستم یہ ہے کہ وہ مدعی یعنی رقیب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے گھومتا پھرتا ہے :۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

دو ایک مزے دار شعر اور ملاحظہ فرمائیے :۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

غالب کا دوسرا پسندیدہ مضمون ہے نامہ بر۔ انھوں نے قاصد کے ہاتھ اپنے محبوب کو خط بھیجا۔ اس نے اس نازنین کا توبہ شکن حسن دیکھا تو خود اس پر مرنے لگا۔ خط کا جواب کیسے لے کر آتا۔ غالب نے سنا تو کہا کہ جانے دو، انسان ہی تو ہے۔ میرے محبوب پر عاشق ہو گیا تو اس کا کیا قصور :-

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے۔ کسی دوست (ندیم) نے کہا کہ پچھلا نامہ بر تو فریبی نکلا۔ ہم تمھیں ایک معتبر نامہ بر مہیا کریں گے۔ شاعر نے کہا رہنے دو وہ بھی اس پر عاشق ہو جائے گا۔ لیکن اصرار پر انھوں نے اس کے ہاتھ خط بھیج دیا۔ اس نے بھی وہی کیا جو پہلے نامہ بر نے کیا تھا۔ غالب کا دوست غالب کو ملا کچھ شرمایا شرمایا تو غالب نے کہا کہ بھائی تم سے تو کچھ کلام نہیں مطلب یہ کہ تم سے

تو کوئی شکایت نہیں لیکن نامہ بر ملے تو کہنا کہ آداب عرض ہے۔ یعنی وہی ہوا نا
جو ہم نے کہا تھا:۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر سے ملے

غالب کی عشقیہ شاعری کلامِ غالب کا ایک اہم پہلو ہے اور ہمیں اعتراف ہے
کہ چند صفحات میں اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا۔ بہرحال غالب
کی عشقیہ شاعری کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا گیا۔

تصوّف

غالب کا ایک مشہور شعر ہے:۔

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کو اپنی متصوفانہ شاعری پر بہت ناز تھا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے
تصوف کے مضامین بہت دلکش پیرائے میں ادا کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر
مضامین فلسفۂ وحدت الوجود سے متعلق ہیں۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری
کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کی واحد ذات ایسی ہے جو معتبر ہے۔ بس ایک
حقیقی ذات تو یہی ہے باقی سب اس کی پرچھائیں ہے۔ اس کی کوئی حقیقت
نہیں۔

صوفیا کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو اپنا عکس دیکھنا منظور
ہوا تو انھوں نے اپنے نور کے ایک چھوٹے سے حصے سے کائنات کو پیدا
کر دیا۔ گویا ساری کائنات اسی کے نور سے بنی ہے اور آخر کار اسی میں ضم یعنی

جذب ہو جائے گی۔ اسی بات کو غالب نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے :۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ایک شعر میں بڑے دل نشیں انداز میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ یہ کائنات وجود میں ہی نہ آئی ہوتی اور ہم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے اگر باری تعالیٰ کو اس آئینے میں اپنا جلوہ دیکھنا مقصود نہ ہوتا۔ فرماتے ہیں :۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں ؛

ان کا عقیدہ ہے کہ نورِ خداوندی کا یہ جزو آخر کار نور میں مل کر اپنی یہ شکل کھو بیٹھے گا اور یہی اس کی معراج ہے :۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اور

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

مشہور صوفی منصور بن حلاج کو اپنی ذات کا عرفان ہو گیا تھا۔ یعنی وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نورِ خداوندی کا ایک حصہ ہوں کیوں کہ اسی کے نور سے میری تخلیق ہوئی ہے۔ اس عرفان سے انھیں اپنی عظمت کا احساس ہوا جسے وہ چھپا نہ سکے۔ یہ راز ان کی زبان پر آگیا۔ وہ انا الحق انا الحق کہتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے۔ اس مضمون کو غالب نے اپنے مخصوص انداز میں ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ہم اسی دریا کا ایک قطرہ ہیں مگر ہم منصور کی طرح نہیں کہ اس راز کو برداشت

نہ کرسکیں :۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

کلامِ غالب سے تصوّف کے چند اور شعر ملاحظہ فرمائیں :۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اب ہم اختصار کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ فلسفۂ وحدت الوجود کا آغاز کہاں سے ہوا۔ شام، عراق، ایران، مصر اور فلسطین مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے تو وہاں افلاطون کا نظریۂ تصورات عام تھا۔ افلاطون نے دنیا کے وجود اور اس کی حقیقت کو غار کی ایک مثال سے واضح کیا ہے جو تمثیلِ غار کے نام سے مشہور ہے۔ فرماتے ہیں فرض کرو ہمیں پا بہ زنجیر کر کے کسی اندھیرے غار میں دھکیل دیا جائے اور ہماری پشت غار کے دہانے کی طرف ہو۔ ہم اس طرح زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں کہ دائیں بائیں اور پیچھے نہ دیکھ سکتے ہوں۔ اس عالم میں ہمارے پیچھے آگ روشن کر دی جائے تو ہمیں اپنے سامنے متحرک پرچھائیاں نظر آئیں گی۔ دنیا کا وجود بس ان پرچھائیوں کے مانند ہے۔ یہ صرف نظر کا دھوکا ہے۔

مسلمان صوفیوں کو اس میں تصور وحدانیت کی جھلک نظر آئی۔ چنانچہ انھوں نے بلا تامل اسے اپنا لیا۔ ذوالنون مصری اس نظریے پر ایمان لانے والے پہلے صوفی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ محبتِ خداوندی جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو بندے کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ذاتِ خداوندی میں جذب ہو جاتا ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کو فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ بایزید بسطامی کا بھی یہی مسلک تھا۔ ایک بار انھوں نے خدا سے دعا کی کہ مجھے اپنے تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ بتا۔ جواب ملا بایزید پہلے اپنے آپ کو تین طلاق دے۔ پھر ہمارا نام لے۔ فرماتے ہیں جب سانپ کے کینچلی اتارنے کے مانند میں بایزید سے باہر نکلا تو دیکھا کہ عاشق و معشوق ایک ہی ذات کے دو روپ ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے فلسفۂ وحدت الوجود کو بہت فروغ دیا۔ ہندوستان میں فلسفۂ ویدانت نے اسے محکم تر کر دیا۔

دنیا فریب نظر ٹھہری اور انسان محض ایک پرچھائیں۔ دنیا اور انسان کی بے وقعتی کے احساس نے مایوسی کے جذبے کو فروغ دیا۔ غالب شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تو فارسی کا شعری سرمایہ ان کے پیشِ نظر تھا اور اس پر حافظ کی حکمرانی تھی۔ وہ ایک صوفی شاعر تھے اور ان کا ارشاد تھا کہ دنیا محض افسانہ و افسوں ہے۔ جہان و کارِ جہاں بے وقعت ہیں۔ فارسی کی شعری روایت اور اس کے ساتھ ہی وحدت الوجود کا فلسفہ ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئے۔ دنیا اور کاروبارِ دنیا کو ہیچ ماننے کا لازمی نتیجہ تھا ایک طرح کی بے دلی، مایوسی اور

حزن وملال۔ غالب کو زندگی میں آلام ومصائب سے سروکار رہا تو غم واندوہ کا رنگ ان کی شاعری میں اور گہرا ہو گیا۔ ایک شعر میں انسان کی بے بسی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے :-

ںشال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

جو پرندہ پنجرے میں قید ہے وہ اپنے گھونسلے کے لیے تنکے جمع کرے۔ اس سے زیادہ نادانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ شعر سراپا مایوسی ہے۔ ان کا مطلعِ سرِ دیوان اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ تصویر سراپا فریاد ہے کہ میری قسمت میں فنا لکھی تھی تو مجھے بنایا ہی کیوں :-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اسی مفہوم کے دو تین شعر اور ملاحظہ فرمائیے

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا　　اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

کہیں یہ تصوف کی ہی کارفرمائی تو نہیں کہ وہ دنیا سے بیزار ہو کر ایسی جگہ جا پہنچنا چاہتے ہیں جہاں انسان کی شکل ہی نظر نہ آئے:۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کئی شعروں میں غالب نے شکایت کی ہے کہ دوستوں کے ہاتھوں مجھ پر بہت ستم ہوئے۔ انسانوں نے اتنا ستایا کہ میں انسان کی صورت سے ڈرنے لگا۔ کتے کا کاٹا ہوا آدمی جس طرح پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح میں آئینے سے ڈرتا ہوں کیوں کہ اس میں مجھے اپنی شکل نظر آتی ہے اور اس سے آدمی یاد آجاتا ہے ـــــ اور آدمی نے مجھے طرح طرح سے اذیتیں پہنچائی ہیں۔ شعر یہ ہے:۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

دوستوں نے دکھ دیئے، دنیا نے ستایا، آلام و مصائب ٹڈی دل کی طرح گھر گھر کے آئے، غرض ساری زندگی غموں سے سروکار رہا لیکن یہ غم غالب کو شکست نہیں دے سکا، انھیں پسپا نہ کر پایا۔ انھوں نے ہر درد کو انگیز کرلیا، ہر غم کو ہنستے ہنستے سہ لیا۔ جہاں اور غم تھے وہاں دنیا کی بے ثباتی اور

اپنی مقداری کا غم بھی تھا اور یہ تصوّف کے راستے ان تک پہنچا۔ اردو شاعری پر جو حزن و یاس کی فضا چھائی ہوئی ہے اس کا ایک سبب تصوف کا غلبہ بھی ہے لیکن تصوف ہی نے غالب کو سہارا بھی دیا کہ غموں کو وہ خاطر میں نہ لائے۔ اپنی اصل زندگی میں بھی، مکاتیب میں بھی اور شاعری میں بھی وہ اپنی تکلیفوں پر ہنستے اور غموں کا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں۔ خوشی کی طرح انھیں غم بھی عارضی اور جلد گزر جانے والا نظر آتا ہے :۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

غالب کے تصوف کے بارے میں ایک اہم بات اور۔ دنیا اور کارِ دنیا کے بارے میں تجسس و تفتیش ان کا مزاج ہے۔ غور و فکر ان کی عادت ہے۔ وحدت الوجود پر ان کا ایمان ہے مگر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور شے کا وجود نہیں تو پھر ہر طرف نظر آنے والی یہ رونق اور یہ سارا ہنگامہ آخر ہے کیا :۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

فلسفیانہ انداز

اقبال کی طرح غالب فلسفی شاعر تو نہیں لیکن حکیمانہ نظر اور فلسفیانہ انداز ضرور رکھتے ہیں۔ اسی لیے

جناب مجنوں گورکھپوری نے انھیں اردو کا پہلا مفکر شاعر کہا ہے اور لکھا ہے کہ غالب کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں کی آسودگی کا سامان موجود ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی۔ غالب نے اسے ذہن دیا۔

شاعری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جو دل کو فرحت بخشتی ہے مسرت کی دولت عطا کرتی ہے۔ دوسری وہ جو دل کو آسودگی دینے کے ساتھ ساتھ دماغ کو غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ پہلی قسم کی شاعری کو اچھی شاعری (GOOD POETRY) اور دوسری قسم کی شاعری کو عظیم شاعری (GREAT POETRY) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ رابرٹ فراسٹ کا ارشاد ہے کہ شاعری مسرت سے شروع ہو کر بصیرت پر ختم ہوتی ہے۔ بصیرت سے یہی مراد ہے کہ وہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ رابرٹ فراسٹ کی رائے کو دہراتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا ہے کہ فکر سے فن کو آب و تاب ملتی ہے۔

یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے کہ کلامِ غالب میں کوئی مربوط فکر نہیں ملتی۔ کوئی منضبط فلسفہ نہیں ملتا۔ بس اتنا ہے کہ دنیا اور کاروبارِ دنیا کے بارے میں وہ غور و فکر کرتے ہیں تجسس ان کی عادت ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بے شمار سوال نظر آتے ہیں :-

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ان کے شاگرد حالی شعر کو اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور شاعری کو اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام بتاتے تھے مگر غالب اس کے قائل نہیں۔ان کی شاعری نہ درس اخلاق ہے، نہ فلسفہ اور نہ پیغام۔ وہ ایک سوچنے والے شاعر ضرور ہیں مگر ان کی سوچ کبھی خطِ مستقیم پر نہیں چلتی۔ وہ کسی ایک رجحان کے پابند نہیں۔ سچی شاعری کسی ایک رجحان کی پابند ہوتی کبھی نہیں وہ تو زندگی کی ترجمان ہوتی ہے۔

کلامِ غالب کا مطالعہ کرنے والا ان کی پراگندہ خیالی سے پریشان ہو جاتا ہے۔ ابھی خوش ہیں، ابھی ناخوش۔کبھی زندگی سے والہانہ عشق رکھتے ہیں، کبھی جینے سے بیزار ہیں۔ ذرا میں رندِ بلا نوش ہیں، ذرا میں صوفی صافی۔ درِ کعبہ وا نہ پاکر لوٹ آنے والے بھی یہی غالب ہیں۔ (بندگی میں بھی وہ آزادہ وخودبیں ہیں کہ ہم ـــــ الٹے لوٹ آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا) اور رقیب کے در پر ہزار بار جانے والے بھی یہی (جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار ـــــ اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں) ایک ہی غالب ہے جو کبھی رنج کا خوگر اور لذتِ آزار کا حریص ہے تو کبھی گردشِ مدام اور ہجومِ نا امیدی سے گھبرا جاتا ہے۔ یہ دونوں شعر غالب ہی کے ہیں :۔

سنبھلنے دے ذرا اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اور سچ تو یہ ہے کہ زندگی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔ غالب نے اپنے ذہن کے سارے دریچے کھلے رکھے، زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور جب جو محسوس کیا اسے شعر کا پیکر عطا کر دیا۔

کلامِ غالب کی اس خصوصیت یعنی مفکرانہ انداز، جذبات و احساسات کے پہلو بہ پہلو، کائنات اور مسائلِ کائنات پر غور و فکر کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:-

"غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و بیان کے کرشمے تھے لیکن وہ حسین و شوخ ذہانت نہیں تھی جو پیکرِ الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ یہ مرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اردو جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیے۔ ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور!"

غالب نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا لیکن تجسس اور حیات و کائنات کے بارے میں غور و فکر ان کی عطائے خاص ہے۔ اردو شاعری جس میں حسن و عشق کی ہزار بار دہرائی گئی کہانیاں تھیں، محبوب کی بے وفائی اور رقیب کی روسیاہی کا بیان تھا، ہجر کے شکوے اور وصال کی آرزوئیں تھیں، اسے زندگی سے آنکھ ملانا سکھایا، زندگی کے اہم مسائل پر سوچ بچار کی راہ دکھائی اور

تجزیہ و تحلیل کی اہمیت سے روشناس کیا۔ غالب نے یہ نہ کیا ہوتا تو ہماری شاعری ترقی کی بلندیوں تک نہ پہنچی ہوتی اور اسے آگے چل کر اقبال جیسا شاعر نصیب نہ ہوا ہوتا۔ بالکل درست کہا گیا ہے کہ غالب نہ ہوتے تو اقبال کبھی نہ ہوتے۔

تخیل

علمائے ادب کا بجا ارشاد ہے کہ شاعری کے لیے سب سے ضروری چیز تخیل ہے۔ اس کے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ جب ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر سے بہتر ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کا تخیل زیادہ قوی ہے۔ غالب کو جو شے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا تخیل ہے۔

تخیل سے مراد ہے خیال کی پرواز۔ تخیل کی سب سے جامع تعریف کولرج نے کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ وہ قوت ہے جو مختلف چیزوں میں یکسانیت اور یکساں چیزوں میں فرق تلاش کر لیتی ہے۔ جس شاعر میں یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی اس کے کلام میں اتنی ہی زیادہ دلکشی ہوگی۔ ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں ہماری نظر اسی تک محدود رہتی ہے مگر شاعر کی نظر اس سے گزر کر جانے کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔ مثلاً ایک ہی پھول ہے جسے دیکھ کر شاعر کو کبھی محبوب کا رخسار یاد آتا ہے، کبھی یہ پھول خدا کی یاد دلاتا ہے، کبھی یہ زندگی کی ناپائداری کا استعارہ بن جاتا ہے، کبھی اس کی بکھری ہوئی پتیاں عاشق کے چاکِ گریباں کی تصویر کھینچ دیتی ہیں۔ اس طرح نت نئے مضامین کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

غالب کے شاگرد حالی نے لکھا ہے کہ تخیل کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ تخیل کی اہمیت کے بہت قائل ہیں مگر ایک شرط بھی عائد کرتے ہیں۔ کہتے ہیں قوتِ متخیلہ کو قوتِ ممیزہ کا تابع ہونا چاہیے مطلب یہ کہ تخیل کو عقل کے تابع فرمان رہنا چاہیے۔ انھوں نے درست فرمایا تخیل بے لگام ہوکر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنے لگے تو شاعری ناقابلِ فہم ہوجاتی ہے اور غالب کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

غالب کا ایک شعر ہے :-

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

تخیل کی بلند پروازی نے اسے چیستاں بنا دیا ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کا محبوب ایسا نازک ہے کہ محوِ خرام ہوا تو پسینہ آگیا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ قطرے کی شکل آنکھ کی پتلی سے مشابہ ہے۔ اسے یہ بدگمانی ہوئی کہ بے شمار آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس نے ٹہلنا موقوف کر دیا۔ شعر کے مفہوم تک پہنچنے کے لیے بڑی دماغ سوزی درکار ہے۔ ایسے شعر سے لطف حاصل نہیں ہوتا دماغی ورزش ہوجاتی ہے یگانہ چنگیزی نے اس شعر پر غور کیا۔ محنت کے بعد مفہوم تک رسائی تو ہوگئی مگر پسینہ انھیں بھی آگیا۔ شعر کا مطلب قلمبند کیا مگر جھنجھلا گئے اور مطلب کا خاتمہ دشنام پر ہوا۔

اپنے ابتدائی دور کے کلام کو غالب نے منسوخ کر دیا تاہم وہ محفوظ رہا

اور بعد کو شایع ہو کر "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ غالب کے پرستاروں سے معذرت کے ساتھ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس میں تخیل کی بلند پروازی، تخیل کی بے اعتدالی کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ پھر بھی دیوانِ غالب میں بہت سے شعر ہیں جنھیں شاعر کے اس کمال یعنی تخیل کی بلند پروازی نے اعلیٰ درجے کی شاعری کا رتبہ عطا کیا ہے۔ حالی نے یادگارِ غالب میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔

یہ رفعتِ تخیل ہی کا کرشمہ ہے کہ مٹی کا کوزہ جمشید کے ساغر سے بڑھ کر نظر آتا ہے :-

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یا پھول کی خوشبو، دل کے نالے اور چراغ سے اٹھنے والے دھوئیں جیسی مختلف اور بالکل بے جوڑ چیزوں میں شاعر یکسانیت تلاش کر لیتا ہے :-

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دیوانِ غالب میں تخیل کی یہ کارفرمائی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔

تہ داری

غالب کے کلام کی ایک اہم خصوصیت تہ داری ہے۔ وہ شاعری کو قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی مانتے ہیں۔ معنی آفرینی تخیل کی کارفرمائی ہے۔ جس شاعر کا تخیل جتنا بلند ہو گا وہ اتنے ہی اعلیٰ درجے کے معنی پیش کرنے پر قادر ہو گا۔ بقول حالی یہ استعداد خداداد ہوتی ہے۔ اس کا

اکتساب یعنی کوشش سے اس کا پیدا کر لینا ممکن نہیں۔ غالب خوش نصیب تھے کہ قدرت نے اس بیش بہا نعمت سے انھیں نوازا تھا۔

تہ داری سے مراد یہ ہے کہ پہلی نظر میں شعر کے ایک معنی واضح ہوتے ہیں۔ غور کیجئے تو اس کی تہ سے دوسرے معنی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ تہ داری شاعری کی عظمت کی دلیل ہے۔

ابہام نثر میں عیب سہی لیکن شعر کی بہت بڑی خوبی ہے۔ غزل رمز وایما کا فن ہے۔ اشارے کنایے میں بہت کچھ کہہ جانے کا آرٹ ہے۔ عام طور پر غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اس لیے غزل کے شاعر کو صرف چند لفظوں میں اپنی پوری بات کہہ دینی ہوتی ہے، پورا خیال ادا کر دینا ہوتا ہے یا اپنا شعری تجربہ ادا کر دینا ہوتا ہے۔ چند لفظوں میں پوری بات ادا کرنے کی مجبوری کے سبب وہ کفایت لفظی سے کام لیتا ہے۔ کچھ کہہ دیتا ہے کچھ اس اعتماد کے ساتھ حذف کر دیتا ہے یعنی چھوڑ جاتا ہے کہ قاری بات کے اس ان کہے حصّے کو خود شعر میں جوڑ کے پورے معنی حاصل کر لے گا۔ تہ داری خاص طور پر اس ابہام سے پیدا ہوتی ہے۔

غالب نے ایک قطعہ کہا تھا جس کے پہلے دو شعر انھوں نے رد کر دیے۔ آخری شعر دیوان میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے :-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شعر کا لفظی مفہوم یہ ہے کہ زندگی جب اس طرح گزری یعنی تکلیفوں میں بسر ہوئی

تو ہم کیسے سمجھیں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔ شاعر یہ واضح نہیں کرتا کہ اسے کیا شکایت ہے اور اس کی زندگی کن تکلیفوں میں بسر ہوئی اسی کا نام ابہام ہے۔ غور کیجیے تو اس کے مختلف اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔ پہلا سبب تو محبوب کی بے وفائی ہو سکتی ہے (ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار) گویا یہاں محبوب کی بے توجہی کا گلہ ہے۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ زندگی میں مالی آسودگی حاصل نہ ہوئی۔ بہت جگہ تنگ دستی کی شکایت کی ہے۔ (لبس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض) مطلب یہ کہ تنگ دستی کا غم ہے۔ تیسری بات یہ ممکن ہے کہ ناقدری نے تکلیف پہنچائی ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں یہ گلہ نظر آتا ہے۔ (آپ ہم کہتے کتے اور آپ اٹھا رکھتے کتے) اس طرح شعر سے تین مطلب برآمد ہوتے ہیں اور اس کا سبب ابہام ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے :-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ دشت کی ویرانی کو دیکھ کے گھر یاد آیا کہ وہ بھی ایسا ہی اجاڑ تھا۔ دوسرا مطلب یہ کہ عشق نے دشت پیمائی کرائی اور اس ویرانی کو دیکھ کے خیال آیا کہ عشق کیا ہی کیوں کہ آباد گھر کو چھوڑ کے ویرانے میں آنا پڑا۔

اس کا تیسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے جو سب سے بہتر ہے۔ پہلے مصرعے کو تحقیر کے انداز میں پڑھیے۔ اس طرح "کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!" کا مطلب یہ نکلے گا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہ ہوئی۔ دوسرے مصرعے کا مطلب یہ کہ اصل ویرانی تو میرے گھر کی ہے جو محبوب کے نہ آنے سے بالکل اجاڑ، سنسان اور دشت کی

دکھائی دیتا ہے۔

ایک اور شعر ہے :-

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صَلا میرے بعد

دوسرے مصرعے میں یہ اشارہ موجود ہے کہ پہلے مصرع کو دو دفعہ پڑھنا ہوگا۔ پہلے سوال کے انداز میں۔ شاعر پوچھتا ہے کوئی ایسا بہادر ہے جو عشق کی مصیبت جھیلنے کی طاقت رکھتا ہو۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔ اب وہ مایوسی کے انداز میں اسی بات کو دہراتا ہے۔ (کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق) اب یہ مطلب نکلتا ہے کہ کوئی کبھی تو نہیں جو اس کام کا حوصلہ کرسکے۔

یہ شعر بہت مشہور ہے :-

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

شاعر کہتا ہے کہ ایک ایک لہر میں سو سو مگرمچھ منہ کھولے ہوئے ہیں۔ دیکھیے بارش کی بوند سیپی کے منہ میں پہنچ کر موتی بنتی ہے یا مگرمچھ کے منہ میں پہنچ کر اس کی خوراک۔ یہ لفظی معنی ہوئے مگر اصل مفہوم اس کی تہ میں کارفرما ہے اور وہ یہ کہ سازگار ماحول میسر آجائے تو انسان جوہر قابل بن جاتا ہے، اس کے برعکس ہو تو انجام بربادی ہے۔

یہی تہ داری شعر میں گہرائی پیدا کر کے اسے لافانی بنادیتی ہے اور دیوان غالب میں ایسے شعروں کی کمی نہیں۔

مشکل گوئی

شعر پڑھ کر یا شعر سن کر لطف نہ آئے، طبیعت کو سرور حاصل نہ ہو تو وہ شعر نہیں کوئی اور شے ہے۔ بعض شعر دماغ کو سکون دینے کے بجائے اس سے ورزش کراتے ہیں اور اسے اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ غالب کے ابتدائی زمانے کا کلام ایک طرح سے مشق کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا ایک حصہ ہمارے لیے پہیلی بن جاتا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کا کہنا ہے غالب کے ابتدائی زمانے کے بہت سے شعر معنی آفرینی نہیں معما آفرینی کے زمرے میں آتے ہیں۔ اگر ان کا شعری سفر وہیں رک جاتا تو شاید آج کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا۔ غالب پختہ تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے نومشقی کے زمانے کا مشکل فارسی آمیز بے کیف کلام رد کر دیا۔ کچھ شعر بطور نمونہ باقی رہنے دیے۔

کلام غالب کے مشکل ہونے کے اسباب کئی ہیں۔ پہلا سبب تو یہ کہ اس میں فارسی الفاظ کا غلبہ ہے۔ مثلاً ایک شعر ہے :-

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں "آیا" کی جگہ "آمد" کر دیجیے تو یہ شعر فارسی کا ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ غالب نے شاعری کا آغاز کیا تو فارسی شعراء کا کلام ان کے پیش نظر تھا۔ انھوں نے بیدل کے کلام کو نمونہ بنایا اور ان کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔ بیدل کے شعر بھی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ ان کی پیروی میں غالب نے بھی مشکل گوئی کا راستہ اختیار کر لیا۔ تیسرا سبب کہ غالب

کا تخیل بہت بلند پرواز ہے۔ تخیل کی بلند پروازی خوبی ہے بشرطیکہ "آنکھ طائر کی نشیمن پر رہے پرواز میں" اگر تخیل کی اڑان اتنی اونچی ہو جائے کہ زمین سے ناتا ہی ٹوٹ جائے تو شعر ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کا یہ مشورہ کہ تخیل کو ہمیشہ عقل کے تابع رہنا چاہیے نہایت اہم ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں غالب پر طرح طرح کی چوٹیں کی ہیں۔ ان کی مشکل گوئی اور تخیل کی بے اعتدالی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا اور بعض ایسے اڑیں گے کہ اڑ ہی جائیں گے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"اکثر شعرا ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"

عہد غالب کے بہت لوگ تھے جو ان کی مشکل گوئی کی شکایت کرتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب بادشاہ کے استاد ذوق کا ہر طرف دور دورہ تھا اور ان کی شاعری زبان کے چٹخارے کی شاعری تھی۔ بعض لوگ لکھنؤ کے اندازِ سخن کے گرویدہ تھے اور شاہ نصیر کے طرزِ کلام کو پسند کرتے تھے۔ ایسے میں غالب کی پیچیدہ خیالی اور ژولیدہ بیانی کی داد دینے والے کہاں سے میسر آسکتے تھے۔ ہاں اس کا گلہ کرنے والے بہت تھے۔ اس زمانے کے ایک شاعر آغا جان عیش نے یہ قطعہ کہا جو بہت مشہور ہوا:۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے　　مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی لیے غالب کو ناقدری کی شکایت رہی۔ نثر اور نظم دونوں میں یہ بات کئی بار دہرائی ہے کہ ہمیں کوئی سخن فہم میسر نہ آیا اور "آپ ہم کہتے تھے اور آپ اٹھار کرتے تھے"۔ عجب کشمکش میں تھے۔ سادہ گوئی کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی تھی اور سیدھے سادے شعروں پر سر دھننے والے غور و فکر کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ ایک رباعی میں شکایت کرتے ہیں :-

مشکل ہے زبس کہ کلام میرا اے دل　　سن سن کے جسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

"سخنورانِ کامل" کی جگہ پہلے "سخنورانِ جاہل" کہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناقدری اور بے توجہی نے ان کے مزاج میں کتنی تلخی پیدا کر دی تھی۔ لوگوں نے انھیں مہمل گو کہا تو انھوں نے جواب دیا :-

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

حقیقت یہ ہے کہ غالب کے قدر دانوں اور پرستاروں کی کمی نہیں تھی لیکن ہر بڑے فن کار کو یہ گلہ ہوتا ہے کہ میں اس سے زیادہ قدر دانی کا مستحق تھا۔ غالب کی عظمت میں کلام نہیں ۔ ان کی بہت قدر ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ قدر دانی کے مستحق تھے جو ہوئی مگر موت کے بعد ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی کہ میرے شعروں کی شہرت میری موت کے بعد ہوگی ۔

انانیت

غالب کے یہاں بے پناہ انانیت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے سوا کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہر بڑے فن کار کو اپنی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد جو مخلوق ہوتی ہے وہ اسے حقیر اور پست نظر آتی ہے۔ دنیا اور اہل دنیا کو وہ اپنی پسند کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور یہ ہو نہیں سکتا۔ اس سے اس کے مزاج میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔ وہ جھنجھلاتا ہے۔ تلخ کلامی پر اتر آتا ہے۔ اس کی تحریروں میں بار بار اپنی برتری کا اظہار ہوتا ہے۔

غالب کو اپنی نثر و نظم دونوں پر ناز تھا اور کسی کو بھی وہ اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"خدا کے واسطے داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میر و میرزا کیا کہتے تھے۔ اگر ریختہ وہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟"

اسی مضمون کے تین شعر ملاحظہ فرمائیں :-

آج مجھ سا نہیں زمانے میں ۔۔۔ شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے ۔۔۔ ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ۔۔۔ ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

غالب کی ایک مشہور غزل ہے :-

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

غالب شناسوں نے اسے انسان کی عظمت کا قصیدہ کہا ہے اور درست کہا ہے لیکن اس میں شاعر کی اپنی عظمت و برتری کا احساس بھی کارفرما ہے۔

طنز وظرافت

غالب نے خطوط اور شاعری دونوں میں طنز وظرافت سے خوب کام لیا ہے اور اس کی تہ میں فن کار کی انانیت کارفرما ہے۔ فن کار دنیا کی ہر شے کو اپنے محدب شیشے سے دیکھتا ہے. اس آلے سے ہر چیز اپنی اصل سے کئی گنا بڑی نظر آتی ہے۔ دنیا خامیوں سے پُر ہے اور فن کار اسے اپنی آرزوؤں اور امیدوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ جھنجھلاتا ہے اور اپنی ناپسندیدہ اشیا، واشخاص کو طنز وتمسخر کا نشانہ بناتا ہے۔ غالب کے یہاں یہ عمل صاف نظر آتا ہے۔

طنز تو زہر بھرے نشتر کی طرح ہوتا ہے لیکن شوخی وظرافت بے ضرر ہوتی ہے۔ اصل زندگی میں بھی، خطوں میں بھی اور شاعری میں بھی غالب نے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے شوخی اور ظرافت کا خوب استعمال کیا ہے۔ یہ خصوصیت ان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ اسی لیے مولانا حالی نے انھیں حیوانِ ظریف کہا ہے اور یہی وہ صفت تھی جس نے احباب میں غالب کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔

ان کے پرستار ان کے لطیفے اور چٹکلے ایک دوسرے کو سناتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ مولانا حالی کے اس شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے :۔

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

غالب کی زندگی آلام و مصائب میں گھری ہوئی تھی۔ اسے گوارا بنانے کے لیے کبھی وہ اس حربے کا استعمال کرتے تھے۔ ان کی چھیڑ چھاڑ، ان کے چٹکلے ایسے تھے جیسے تاریک رات میں چمکتے ہوئے جگنو۔

غالب کا طنز و ظرافت ہمہ گیر ہے۔ وہ کسی کو بخشتے نہیں۔ رقیب تو ہے کس شمار میں۔ اس کا خاکہ بہتوں نے اڑایا ہے مگر غالب کے طنز سے اس کا محبوب بھی نہیں بچا۔ حور، فرشتے، جنت، دوزخ کون ہے جو اس کی زد میں نہ آیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی بے ادبی کرنے سے وہ ہچکچاتے نہیں۔ کچھ شعر دیکھیے :۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا، رخسار رہن غازہ تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے ۔۔۔ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اپنے اوپر ہنسنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ غالب اس کا بھی سلیقہ رکھتے تھے خطوط کا مطالعہ کیجیے تو اس خط پر نظر ٹھہرتی ہے جس میں انھوں نے اپنا کارٹون بنایا ہے اسے غور سے دیکھیے تو ہنسی کم آتی ہے، رونا زیادہ مرزا صاحب کا گریبان قرض خواہوں کے ہاتھ میں ہے اور یہ اپنے آپ کو اپنا غیر سمجھ کر حیران ہوتے ہیں اور سوال کرتے ہیں "کیوں نواب صاحب یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو بولو، کچھ تو جواب دو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔" شاعری میں بھی وہ اپنی مضحکہ خیز تصویر آپ بناتے ہیں۔ خود ہنستے ہیں اوروں کو ہنساتے ہیں دیکھیے:۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غالب ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

اور یہ تصویر اتنی تیکھی نہ سہی مگر ہے یہ بھی مزے دار :۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یہ ہے غالب کے طنز و ظرافت کا مختصر سا تعارف!

آفاقیت

آخر میں کلام غالب کی اس خصوصیت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس نے اسے ابدیت عطا کی، جس نے غالب کو ہر عہد کا اور ہر خطۂ زمیں کا شاعر بنا دیا۔ اس خصوصیت کو آفاقیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

شاعری کی عظمت کا اصل راز یہ ہے کہ وہ زمان و مکاں سے ماورا ہوتی ہے۔ مثلاً غالب نے کہا:۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے اسے غموں سے نجات نہیں مل سکتی۔ شمع کو دیکھ لو کہ صبح ہونے تک اس کی قسمت میں جلنا ہی جلنا لکھا ہے۔ یہ زندگی کی بہت بڑی سچائی ہے۔ اس صداقت کو ہر زمانے میں اور ہر ملک میں تسلیم کیا جائے گا۔ جس زمانے میں یہ شعر کہا گیا اس وقت بھی دل پر اثر کرتا تھا، صدیوں بعد بھی کرتا رہے گا۔ دہلی کی سرزمین پر کہا گیا یہ شعر بمبئی، مدراس بلکہ دنیا کے سارے ملکوں میں پڑھنے والوں کو متاثر کرے گا۔ جو لوگ اردو نہیں جانتے وہ اس کا ترجمہ سن کر واہ واہ کریں گے۔ گویا اس شعر کو نہ زمانہ قید کر سکا اور نہ مقام۔ یہ زماں (زمانہ) اور مکاں (مقام) دونوں سے بلند

ہو گیا۔

زندگی دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔ ہر ایک کو ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ شاعر کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے وہ اسے پوری سچائی کے ساتھ اور بہت دلکش انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ جو اس شعر کو پڑھتا ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ واردات خود اس کے دل پر گزری ہے۔ اسی کا نام آفاقیت ہے۔ غالب نے اپنے تجربات بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کر کے اپنے شعروں کو زمان و مکاں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ہر زمانے اور دنیا کے ہر حصے میں وہ داد و تحسین حاصل کرتے رہیں گے۔ صرف چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں :-

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اور

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جب کوئی دوست دشمنی پر کمر بستہ ہو جائے تو پہلا مصرع زبان پر آ سکتا ہے اور جب کبھی کوئی تکلیف پہنچا کر شرمندہ ہو اور اس کی شرمندگی سے کچھ حاصل نہ ہو سکے تو دوسرا مصرع یاد آئے گا۔ یہ دونوں مصرعے ضرب المثل بن کر زبان زد ہو گئے ہیں۔ یہ ان کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

اور اب کچھ اور شعر :-

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

اندازِ بیان

ہمارے منھ سے جو بات نکلتی ہے اس کے دو پہلو ہوتے ہیں (۱) کیا بات کہی گئی اور (۲) وہ کن لفظوں میں ادا ہوئی۔ وہی بات یاد رکھی جاتی ہے جو اہم ہو اور عمدہ لفظوں میں کہی گئی ہو۔ معنی اور لفظ کا یہ رشتہ نہایت اہم ہے۔ ادب میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ بیشتر علمائے ادب نے لفظ اور معنی، اسلوب اور مواد کو برابر کی اہمیت دی ہے البتہ شاعری میں لفظ یعنی اندازِ بیان کی اہمیت زیادہ ہے۔ مولانا شبلی نے درست فرمایا کہ کہنے کے لیے تو ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ موجود ہے لیکن اسے ڈھنگ سے ادا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

عظیم شاعری میں اندازِ بیان اور خیال دونوں اعلیٰ درجے کے ہوتے

ہیں ۔ اندازِ بیان کی دلکشی دل کو مسرت کی دولت عطا کرتی ہے اور خیال فکر کو بیدار کرتا ہے ۔ غالب ہماری زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری سے دل اور دماغ دونوں کو آسودگی حاصل ہوتی ہے ۔

فنی نقطۂ نظر سے شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ شعر میں حسن مصوری اور موسیقی سے پیدا ہوتا ہے ۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں یہ دونوں خوبیاں وافر مقدار میں نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی چیزیں ہیں جن سے شعر کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ ان چیزوں کو شعری لوازم یا فنی تدابیر کہا جاتا ہے ۔ اب غالب کی شاعری میں ان فنی تدابیر کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔

مصوری

جرمن زبان میں شاعری کے لیے ایک ایسے لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اچانک کسی تصویر کا پیش نظر ہوجانا تصویر کشی کا یہ فن روزِ اوّل سے ہماری شاعری کا ایک حصہ رہا ہے ۔ اسے مرقع کشی ، پیکر تراشی ، امیجری وغیرہ نام دیئے جاتے ہیں ۔ ہماری زبان کے عمدہ شعروں کا انتخاب تیار کیا جائے تو وہ دلکش تصویروں کا البم ہوگا کیوں کہ ایک ایک صفحے پر کئی کئی تصویریں نظر آئیں گی ۔

غالب کی شاعری میں فکر کا عنصر ان کے پیش رو شعراء سے زیادہ ہے اور خیال بمشکل ہی تصویر بن پاتا ہے ۔ دیوانِ غالب میں تصویریں نظر نہ آتیں یا بہت کم نظر آتیں تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے ۔ یہاں تصویریں اچھی خاصی تعداد میں نظر آتی ہیں۔ مطلعِ سر دیوان ہی کو لے لیجیے :-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کہتے ہیں قدیم ایران میں فریادی کاغذ کا لباس پہن کر دربار میں حاضر ہوتے تھے تاکہ انھیں دور سے ہی پہچان لیا جائے اور بلا تاخیر فریاد سن لی جائے تصویر کا لباس تو بلا مبالغہ کاغذی ہوتا ہے اور فریاد اس کی مصور کی شوخیِ تحریر سے یہ ہے کہ میری قسمت میں اتنے جلد فنا ہو جانا تھا تو بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ شعر پڑھیے تو ایرانی دربار کا نقشا اور فریادی کا گلہ سبھی کچھ فلم کی طرح آنکھوں کے آگے سے گزر جاتا ہے۔ شعر کی تہ میں جائیے تو ایک اور تصویر ابھرتی ہے۔ بندہ اپنے خالق کے دربار میں فریاد کر رہا ہے بقول آتش کہ : عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا۔

ایک ہی غزل میں محبوب کی بہت سی تصویریں دیکھیے :۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

ایک شعر میں محبوب کے نظریں جھکا لینے کی تصویر اس رمز و ایما کے ساتھ کھینچی ہے جیسے یہ ماڈرن آرٹ کا نمونہ ہو کہ کچھ دکھا دیا کچھ دیکھنے والے کے تصور پر چھوڑ دیا :۔ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

ظرافت تو ان کے مزاج کا حصہ ہے ہی۔ خود اپنی تصویر ایسی بناتے ہیں کہ جو دیکھے ہنس پڑے:۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

کیسی جیتی جاگتی متحرک تصویر ہے۔ ایک مثال اور:۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

ایک اور بھرپور تصویر ملاحظہ ہو:۔

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

کہا جاتا ہے کہ بڑی شاعری کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ڈرامے کے نزدیک آجاتی ہے۔ دیوان غالب میں ایسے متعدد اشعار ملتے ہیں جہاں ہم کچھ سنتے نہیں، اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آتے دیکھتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص چمن میں بیٹھا ہوا نت نئے پھول کھلتے ہوئے دیکھ کر کہتا ہے:۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ایک اور شعر ہے:۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ایک پرند پنجرے میں قید ہے ۔صیاد دوسرے پرند کو لاکر اسی میں بند کر دیتا ہے ۔
پہلا پرند دوسرے سے پوچھتا ہے کہ دوست تم تو سیدھے چمن سے آئے ہو ۔ ذر
بتاؤ چمن کا کیا حال ہے ۔میرا آشیاں کیسا ہے ۔ وہ کچھ بتاتے بتاتے رک جاتا ہے
کہ اسے تکلیف ہوگی ۔شاید یہ بتانا چاہتا ہے کہ بھائی اب چمن کہاں ، تمھارا آشیاں
کہاں ۔بجلی گری اور سب جل کے راکھ ہوگیا ۔پہلا پرند سب کچھ سمجھ جاتا ہے اور کہتا
ہے ۔میرے بھائی تم چمن اور میرے آشیاں کی بربادی کا حال بتاتے بتاتے
چپ کیوں ہو گئے ۔ اب وہ آشیاں میرا کہاں رہا ۔اس کے جل جانے کا مجھے
کیا غم ۔ میری قسمت میں تو اب یہیں رہنا لکھا ہے ۔

یہ شعر پڑھیے تو پورا ڈراما ہماری آنکھوں کے سامنے پیش آجاتا ہے ۔

استعارہ و تشبیہ سے تصویر کشی میں بڑی مدد ملتی ہے ۔مثلاً جب وہ اپنے محبوب
کے جمال دل فروز کو مہرِ نیم روز سے تشبیہ دیتے ہیں یا اپنے ایک عزیز کو ماہِ شب
چہار دہم (چودھویں کا چاند) کہتے ہیں تو آنکھوں کے آگے چاند سورج کی تصویر
کھنچ جاتی ہے ۔ رنگ و نور میں ان کے لیے بہت کشش ہے ۔ وہ اپنے حسی پیکروں
میں ان سے بہت مدد لیتے ہیں ۔ خورشید و ماہ ، گل و گلستاں ، آبِ رواں ، قطرۂ
خون ان کے پسندیدہ استعارے ہیں ۔

موسیقی اسے نغمگی کہیے ، ترنم کہیے یا موسیقی کہیے ۔ یہ ایک ایسی خصوصیت
ہے کہ اس کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا ۔نظم کو اگر گایا نہ جاسکے
تو وہ نظم کہلانے کی مستحق نہیں ۔ غزل کا تو اس خوبی کے بغیر تصور ہی ناممکن ہے ۔
ہر مصرعے کا یکساں وزن اور قافیہ و ردیف کا آہنگ غزل کی نغمگی میں اضافہ کرتا

ہے ۔ یہ نغمگی غالب کی غزلوں کا وصف خاص ہے ۔ ان کے دیوان میں گنتی کی غزلیں ایسی نکلیں گی جنہیں اچھی اور دل کو لبھا لینے والی دھن میں گایا نہ جاسکے۔

غالب کو فنِ موسیقی سے بہت دلچسپی تھی ۔ اس فن میں وہ یکتائے روزگار نہ بھی اس کے رمز شناس ضرور تھے ۔ بات ہم کیسے بھول جائیں کہ عشق بھی کیا تو ایک ڈومنی سے ۔ اگر ان کے اپنے بیان کو من وعن درست مان لیں کہ وہ اس پر مرے نہیں بلکہ اسے مار رکھا تھا ۔ ("ہم نے بھی ایک ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا تھا") تو بھی اتنی حقیقت تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ وہ ان پر مرمٹی ہو گی تو صورت سے زیادہ ان کی غزلوں کی نغمگی پر۔

جناب مجنوں گورکھپوری نے فرمایا ہے کہ :۔

"مرزا غالب کے لیے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے ۔ ان کے کلام میں جو آہنگ یا ترنم ہوتا ہے وہ لفظی یا سطحی نہیں ہوتا بلکہ تہہ دار اور گمبھیر ہوتا ہے ۔ ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فکر و احساس کے ارتعاشات الفاظ کے صوتی ارتعاشات میں سما کر ایک راگ پیدا کر رہے ہیں جو بلیغ بھی ہے اور طربناک بھی اور جو ہمارے دل و دماغ دونوں کے لیے راحت آفریں ہے۔"

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے ہے کہ :۔

"غالب کے یہاں غضب کا ترنم ، موسیقیت اور نغمگی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کی فکر ہی مترنم ہے ۔"

غالب کو شعر میں ترنم پیدا کرنے کا سلیقہ آتا ہے اور وہ اس لیے طرح طرح کی

تدبیریں استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر لیجیے :۔

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

غزل کے ردیف و قافیہ کے علاوہ اس شعر میں تین اندرونی قافیے استعمال ہوئے ہیں : دل فروز، نیم روز اور نظارہ سوز۔

غالب کا تقریباً تمام کلام مترنم ہے لیکن بعض غزلوں میں یہ ترنم تیز ہے۔ ان میں یہ غزلیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں : کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو، رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو، عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی، دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے، مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے، گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر، یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔

انتخابِ الفاظ

تخلیقِ ادب کا پہلا مرحلہ ہے الفاظ کا انتخاب اور دوسرا ان کی ترتیب۔ شاعری میں ان دونوں کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ موضوع اپنے لیے الفاظ کا انتخاب خود کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے الفاظ کی ترتیب اور یہ بہت مشکل کام ہے۔

بقول شمس الرحمٰن فاروقی شاعری کی زبان بڑی توڑی مروڑی زبان ہوتی ہے۔ شعر کا وزن، قافیہ و ردیف کی پہلے سے متعین جگہ لفظوں کی فطری ترتیب کو برقرار نہیں رہنے دیتے۔ شاعری میں بول چال کی زبان کو ہر جگہ اہم مانا گیا ہے اور ہر شاعر کی ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ بول چال کی زبان میں لفظوں کی جو

ترتیب ہوتی ہے کسی طرح اس کے شعروں میں وہی ترتیب قائم رہے مگر یہ کام ہے بہت مشکل۔ غالب جیسے مشکل گو کی بھی یہی کوشش رہتی ہے اور زبان پر مکمل گرفت ہونے کے سبب وہ اس میں کامیاب بھی رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ شعر دیکھیے :۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

ہاں وہ نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے   ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے   آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا   تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

فارسی تراکیب سے بھی غالب نے اپنی شاعری میں بہت کام لیا ہے۔ فارسی شاعری اور فارسی زبان پر انھیں بہت عبور تھا۔ ان ترکیبوں کی معنویت

اور ان کی نغمگی سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ترکیبوں کے انتخاب میں غالب نے اپ
سلیقے کا ثبوت دیا ہے اور شعروں میں انھیں اس طرح جمایا ہے جس طرح مرصع س
زیور میں نگینے جڑتا ہے۔ دیوانِ غالب کے ہر ہر صفحے پر فارسی تراکیب کا ہنرمندا
استعمال دیکھا جا سکتا ہے اس لیے مثالوں کا پیش کرنا ضروری نہیں۔ پھر بھی چند
شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں :-

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ابہام

کلام غالب کو ابہام نے خاص طور پر دلکشی عطا کی ہے۔ ابہام شعر یا نظم کو چیستاں نہ بنا دے تو اس کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نثر میں وضاحت اور قطعیت ہونی چاہیے۔ مطلب یہ کہ کہنے والے کے دل میں جو بات ہے بالکل وہی بات سننے والے کی سمجھ میں آئے۔ اس میں کسی طرح کا الجھاؤ نہ ہو۔ اس کے برخلاف نظم یا شعر سے کئی کئی مطلب نکل سکتے ہیں۔ غالب اس تکنیک سے خوب کام لیتے ہیں۔ اس بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں :-

> "غالب کی شاعری میں ابہام کا رنگ خاصا گہرا ہے لیکن اس کا سبب مشکل پسندی نہیں ہے۔ یہ رنگ تو ان کے تجربے کی تہ در تہ کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں تو ان کے فکر کی گہرائی اپنے

آپ کو رونما کرتی ہے۔ اس کا منبع ان کے احساس کی شدت، جذبے کی پر پیچ کیفیت، ان کے شعور کی گہرائی اور فکر کی بلند پروازی ہے۔"

مثال کے طور پر غالب کے اس شعر کو لیجیے :-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس شعر سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ شاعر کو کس بات کی شکایت ہے۔ ذہن کبھی ایک طرف جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔ خیال آتا ہے کہ شاعر کو اپنے محبوب کی بے وفائی کا گلہ ہے، پھر خیال آتا ہے کہ ناقدری کی شکایت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تنگ دستی کی شکایت ہو۔ تینوں جواب درست معلوم ہوتے ہیں۔ صحیح جواب کی تلاش میں ذہن مختلف سمتوں میں سفر کرتا ہے اور اس طرح جستجو اور معنی یابی کا لطف اٹھاتا ہے۔

دیوانِ غالب میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جنھیں ابہام نے دلکش و پر لطف بنا دیا ہے۔

فکر کا عنصر

کوئی فضول بات کیسی ہی دلکش زبان میں کیوں نہ ادا کی جائے قابلِ قدر نہیں ہو سکتی۔ اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ مواد پر بھی غور کرنا ہوتا ہے تبھی شعر کے مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا ہے کہ "فکر سے فن کو آب و تاب ملتی ہے"۔ وہ شاعری جو صرف دل بستگی کا سامان فراہم کرے اور دماغ کو غذا فراہم نہ کرے عظیم شاعری

کہلانے کی مستحق نہیں۔ رابرٹ فراسٹ کا کہنا ہے کہ شاعری مسرت سے شروع ہو کر بصیرت پر ختم ہوتی ہے۔ یہ خیال بھی درست نہیں کہ بیان کی دلکشی مسرت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مصوری اور موسیقی بذات خود منزل نہیں، منزل کے راستے کو خوشگوار بنانے کے وسائل ہیں۔ اگر مواد بھی اہم ہو مثلاً شعر میں پیش کیا گیا تجربہ معنی خیز ہو تو یہ مسرت مکمل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ ہے ــــ نظم یا شعر کو پڑھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے بعد دنیا اور کاروبار دنیا کے کسی پہلو کا انکشاف: زندگی کی کسی چھوٹی یا بڑی حقیقت کی آگہی ــــ اسی کا نام بصیرت ہے۔ کلام غالب کے مطالعے سے مسرت کی دولت اور بصیرت کی نعمت دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ غالب نے اردو غزل کو ذہن دیا، غور و فکر کی قوت عطا کی، اپنے دلکش اندازِ بیان سے اس کی دل آویزی میں اضافہ کیا۔ انھیں اس پر ناز تھا اور بجا تھا۔ درست فرماتے ہیں:-

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

یہی ادائے خاص اردو شاعری کو غالب کی عطائے خاص ہے۔ اسی نے انھیں عمر جاوداں عطا کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے دیوانِ غالب کو تاج محل کا ہم پلہ ٹھہرایا تو کیا غلط ہے۔

غالب ـــــ قصیدہ نگار

انیسویں صدی کے وسط میں جب مغلیہ سلطنت مٹنے والی اور قلعۂ دہلی کی ادبی محفلیں سدا کے لیے اجڑنے والی تھیں، یہاں چند ایسے باکمال شعراء موجود تھے جو کسی عظیم الشان سلطنت کے لیے بھی باعثِ فخر و ناز ہو سکتے تھے۔ مولانا حالیؔ فرماتے ہیں:

> "تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسنِ اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے۔"
>
> ـــــ یادگارِ غالب، ص ۱ طبع لاہور ۱۹۶۳ء

ان باکمالوں کے لیے اپنی فنی صلاحیت کا اظہار بھی ضروری تھا۔ انھیں کوئی اکبر و شاہجہاں میسر نہ تھا تو نہ سہی، بدرجۂ مجبوری انھوں نے ہندوستان کے بے اختیار اور مفلس بادشاہ بہادر شاہ کو ہی اپنا ممدوح بنایا اور اپنے زورِ تخیل سے اسے شہنشاہِ ہفت اقلیم کا درجہ عطا کر دیا۔ دربارِ دہلی کے ان باکمال شاعروں میں ذوقؔ و غالبؔ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ذوقؔ

تو بہادر شاہ کے استاد تھے اس لیے دربار سے ان کا دن رات کا تعلق تھا۔ ان کے شاگرد محمد حسین آزاد کے مطابق :

"استاد ذوق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ہر ایک جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں وہ الگ تھیں۔ جب تک اکبر بادشاہ زندہ تھے ان کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد بہادر کو سناتے۔ دوسرے دن ولی عہد ممدوح اس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سناتے۔"

غالب کا معاملہ یہ تھا کہ انھیں شاہانہ زندگی گزارنے کی خواہش تھی جو انھیں دربدر لیے پھری۔ کبھی شاہِ دہلی کی مدح کی، کبھی تاج برطانیہ کی شان میں قصیدہ لکھا، کبھی لکھنؤ اور رامپور کے درباروں سے امیدیں وابستہ کیں۔ ان کی قدردانی ہوئی اور انعام و اکرام سے نوازے گئے لیکن جو کچھ ملا خواہش اس سے بہت زیادہ کی تھی، اس لیے آخر تک قصیدے لکھتے اور معقول صلہ پانے کی آرزو کرتے رہے۔

غالب کی قصیدہ گوئی کا ایک محرک اور بھی تھا۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے زمانے کے مروجہ علوم پر انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی زبان ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گئی تھی کہ اس پر ساری زندگی فخر کرتے رہے۔ نامور فارسی شعراء کا کلام ازبر تھا۔ ایک اور چیز جو انھیں اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے زندگی کا وسیع تجربہ۔ انھیں وہ آسائشیں

میسر آئیں جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں مگر انھوں نے وہ صعوبتیں بھی جھیلیں جن سے کم لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ شہرت و ناموری پائی تو ایسی کہ پرستاروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچی، رسوائی ملی تو ایسی کہ قمار بازی کے جرم میں قید و بند کی مشقت برداشت کی اور موت کے آرزومند ہوئے۔ عیش کا وہ زمانہ دیکھا کہ فکر دنیا سے بے نیاز ہو گئے اور مفلسی کے دن دیکھے تو ایسے کہ ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں

"اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ وہ جو کسی بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

مطلب یہ کہ غالب کا وسیع مطالعہ، گہرا مشاہدہ اور زندگی کے یہ تلخ و شیریں تجربات اظہار کے مختلف پیرائے تلاش کرتے تھے اور ان کی تشفی نہ کسی ایک زبان میں ہوتی تھی اور نہ کسی ایک صنف میں۔ اس لیے غالب نے ایک نہیں دو زبانوں کو وسیلۂ اظہار بنایا، نثر و نظم دونوں میں خامہ فرسائی اور غزل کے علاوہ قصیدہ و مثنوی میں بھی اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔

ابتدائے شعر گوئی سے لے کر عمر کے آخری حصے تک غالب نے بہت سے قصیدے کہے ـــــ اردو میں کم فارسی میں زیادہ ـــــ ان کے علاوہ چند مدحیہ قطعات بھی کہے۔ یہاں ان کی قصیدہ نگاری کا جائزہ صرف اردو قصائد کی بنیاد پر لیا جائے گا جن کی تعداد چار ہے۔ ان میں سے دو قصیدے ـــــ

* ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار

* دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

منقبت میں ہیں اور باقی دو ــــ

* ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام

* صبح دم دروازۂ خاور کھلا

بہادر شاہ کی مدح میں ہیں۔

اب ان چاروں قصیدوں کے اجزائے ترکیبی (تشبیب، گریز، مدح اور دعا) کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے۔

تشبیب قصیدے میں تشبیب کی حیثیت تمہید کی ہوتی ہے اور اس کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کی توجہ کو فوراً گرفت میں لے لیا جائے قصیدہ نگار کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ پہلے ہی شعر سے سننے والوں کو مرعوب و متاثر کرلے اس لیے تشبیب پر وہ بطور خاص توجہ کرتا ہے۔ غالب کو اپنی تشبیب پر بہت فخر تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردوں۔ میرے قصیدے کو دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤگے اور مدح کے شعر کم تر۔"

(مکتوب بنام ہرگوپال تفتہ)

وہ کہا کرتے تھے کہ ــــ

"قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں
افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے
ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔"

(حالی، یادگار غالب ص ۷۱)

غالب کی اس رائے سے حالی بھی اتفاق کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

"مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی
مرتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی بلندی و پستی کا اندازہ
کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں
خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا، سیٹھا،
ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا۔ علی الخصوص متاخرین نے مبالغے
کی لے کو بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا
ہے اور اس کلیے سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں؛ البتہ عرفی
نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اسی
کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن
نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اس سے معریٰ ہیں۔
لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیہیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی
تشبیہوں سے سبقت لے گئی ہیں۔"

(یادگار غالب، ص ۳۲۴، طبع لاہور ۱۹۶۳ء)

جن چار قصیدوں کا اوپر ذکر ہوا، ان میں پہلے قصیدے کی تشبیب

بہاریہ ہے۔ گیارہ اشعار کی اس تشبیب میں بہاریہ کی کوئی زندہ تصویر بنتی نظر نہیں آتی۔ دوسرے قصیدے کی تشبیب متصوفانہ ہے۔ تشبیب کے دس اشعار میں فلسفۂ وحدت الوجود کی تائید اور کثرت کی نفی کرتے ہوئے علائق دنیا سے دامن بچانے کی تلقین کی گئی ہے۔

تیسرا قصیدہ جو بہادر شاہ کی مدح میں ہے "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" اس کی تشبیب نہایت دلکش اور پر اثر ہے۔ ہلال عید کی خمیدہ شکل دیکھ کر شاعر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کے سلام کو خم ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ سوال کرتا ہے کہ اے پہلی تاریخ کے چاند تیری کمر کیوں خم ہے؛ تو کسے جھک کے سلام کر رہا ہے؛ (ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام + جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام) جواب نہیں ملتا تو شاعر کہتا ہے کہ تو اس کا نام نہیں جانتا تو لے میں بتاتا ہوں ــــ

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن　　　نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　　مظہر ذوالجلال والاکرام

غالب کے اردو قصیدوں میں اس قصیدے کی تشبیب سب سے زیادہ پر کشش اور جاندار ہے۔ نہ مغلق ترکیبیں ہیں نہ دور از کار تشبیہیں اور نہ پیچیدہ اندازِ بیان۔ سوال جواب کے انداز نے اس تشبیب کو ایک ڈرامائی شان عطا کر دی ہے۔ کلیم الدین احمد جو اپنے کلاسیکی سرمائے کی خوبیوں سے زیادہ اس کی خامیوں پر نظر رکھتے ہیں، اس کے بارے میں فرماتے ہیں ــ

"یہاں غالب نے بالکل نیا راستہ نکالا ہے۔ قصیدے کے

رسمی محاسن کا نام یہاں نام ونشان نہیں۔ زبان میں سلاست روانی، متانت ہے لیکن وہ شان وشوکت نہیں، وہ طمطراق نہیں، وہ بلند آہنگی نہیں جسے قصیدے کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً سودا کے ایک قصیدے کی تشبیب اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل
تیغِ اردی نے کیا باغِ خزاں مستاصل

ایک طرف یہ رنگ اور عموماً یہی رنگ محیط ہے اور دوسری جانب یہ سادگی ہے کہ ــــ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یہاں فضا دوسری ہے، نئی ہے، فطری ہے اور اسی وجہ سے اس میں ایک تازگی ہے، ایک ڈرامائی شان ہے جو مشکل سے کہیں ملتی ہے۔ کہیں لہجہ بول چال کا ہے ــــ

بارے دو دن کہاں رہا غائب

ان الفاظ کی ترتیب، لب ولہجے کی فطری بے ساختگی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی باتیں کر رہا ہے اور پھر مکالمے کی شان پیدا ہو جاتی ہے ــــ

بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

یہ تو چند مثالیں تھیں۔ دوسرے تمام شعروں میں اسی طرح کا تغیر و تبدّل اور مد و جزر رہتا ہے۔"

(اردو شاعری پر ایک نظر)

چوتھے قصیدے کی تشبیب تیسرے کے ہم پلّہ نہ سہی لیکن ہے جاذبِ نظر۔ خوبصورت تشبیہوں نے اس تشبیب کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ شاعر کا تخیل صبح کے سورج کو بادۂ گل رنگ کے ساغر کی شکل میں پیش کرتا ہے اور چوں کہ صبح دم سلطان کی محفل آراستہ ہو رہی ہے اس لیے ساقی گردوں نے بادشاہ کی صبوحی یعنی شراب صبح گاہی کے لیے یہ سنہری جام لا رکھا ہے۔ تشبیب کے نقطۂ نظر سے غالبؔ کے اردو قصائد بہت سے اردو فارسی قصیدوں پر بھاری ہیں۔

گریز

تمہید یعنی تشبیب کے بعد جب قصیدہ نگار مدح کا آغاز کرتا ہے تو ان دونوں یعنی تشبیب و مدح کے درمیان اسے ایک ریشمیں گرہ لگانی ہوتی ہے۔ اسی گرہ کا نام "گریز" ہے۔ ایک دو شعر کہہ کر شاعر مدح کا اس طرح آغاز کرتا ہے کہ بات میں سے بات نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں شاعر کو اپنی ذہانت کا بہترین مظاہرہ کرنا پڑتا ہے تبھی اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ غالب یہاں بھی پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہلال سے سوال کرتے ہیں کہ تو جھک کے کسے سلام کر رہا ہے۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ بہادر شاہ کو۔ اس کے بعد بہادر شاہ کی مدح بالکل فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ صبح کا سنہری سورج شاعر کو سونے کا پیالہ نظر آتا ہے جو بہادر شا

کی محفل کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ کا نام آیا اور ان کی مدح کے لیے میدان ہموار ہوا۔

قصیدۂ منقبت کا آغاز تصوف کے مسائل سے ہوتا ہے لیکن معاً شاعر کو خیال آتا ہے کہ وہ کن مسائل میں الجھ گیا۔ اپنے دل سے اوہام دور کرنے کے لیے وہ لاحول پڑھتا ہے اور علی کا نام لیتا ہے۔ بس یہیں سے مدح کا دروازہ آپ سے آپ کھل جاتا ہے۔

مدح قصیدے کا اصل مقصد ہے کسی کی تعریف و توصیف۔ یہیں قادر الکلام شاعر زورِ کلام صرف کرتا ہے۔ یہاں وہ جس قدر زیادہ مبالغے سے کام لیتا ہے اتنا ہی کامیاب قرار پاتا ہے۔ حالیؔ نے بے جا مبالغہ آرائی کو قصیدے کا عیب بتایا ہے۔ اور اسی عیب سے داغدار ہونے کے سبب وہ اردو قصائد کے "ناپاک دفتر" کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر ٹھہراتے ہیں لیکن اصلیت یہ ہے کہ مبالغے کے بغیر کوئی شاعر مدح کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اردو میں سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدے اسی مبالغہ آرائی کا کمال ہیں۔ غالب حد سے بڑھی ہوئی مدح کو "بھٹئی" بتاتے ہیں اور اسے اپنے مرتبے کے منافی قرار دیتے ہیں۔

اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ غالبؔ مدح گوئی میں دوسرے قصیدہ نگاروں کی ہم سری کیوں نہیں کرپاتے۔ غالبؔ کے بعض نقادوں نے ان کی خودداری کو اس کا سبب قرار دیا ہے اور اس واقعے کو بہت اہمیت دی ہے کہ دلی کالج کے انگریز پرنسپل نے ان کی پذیرائی سے انکار کر دیا تو انھوں نے

کالج کی ملازمت ٹھکرادی اور پالکی سے اترے بغیر واپس چلے آئے اور غالبؔ کے اس جملے کو بار بار دہرایا ہے جو اوپر نقل ہوا کہ بھانڈوں کی طرح بکنا میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن غالب کے اس بیان کو آسانی سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ خطوطِ غالبؔ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اکثر سخت مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے بار بار اہلِ ثروت کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ سیکڑوں کی جھوٹی خوشامد کی۔ بہت سے خطوں میں خود کو فقیر، نادار اور خیرات خوار لکھا۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ـــــ

"اس قصیدے سے مجھ کو عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔"

(بنام یوسف مرزا)

"آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدرالدین مرحوم کی زوجہ کو یان سو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں، فقیر کو بھی یہ توقع ٹھہری کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا۔"

(بنام نواب رام پور)

"آخر عمر میں تین التماسیں آپ سے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہزار بارہ سو روپے قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری التماس یہ ہے کہ حسین علی خاں کی شادی آپ

بخشش خاص سے ہو جائے۔"

(بنام نواب رام پور)

"فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا دوں گا۔"

(بنام سیاح)

اس خوشامد اور گداگری کا سبب تنگدستی اور تنگدستی کے ساتھ یہ خواہش تھی کہ شاہانہ زندگی بسر کریں۔ شہر میں جو عزت ہے وہ برقرار رہے اور دربار میں جو "نمبر" ہے وہ قائم رہے۔ اس کے لیے جگہ جگہ ہاتھ پھیلایا اور یہ کوشش بھی کہ فلاں کو جو مدد ملنے والی ہے وہ اسے نہ ملے مجھے مل جائے مگر خود ہی کہہ گئے کہ انسان ہوں اور انسانی کمزوریوں سے مبرا کیسے ہو سکتا ہوں۔ (خوے آدم دارم آدم زادہ ام۔)

غالب مدح سرائی کو موجب ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے۔ جو خطوں میں صاف صاف خوشامد کرتا ہو اور موقع بے موقع دست طلب دراز کرنے میں نہ ہچکچائے وہ شعر میں مدح سے کیوں تامل کرے گا لیکن اصلیت یہ ہے کہ وہ بلند پرواز تخئیل رکھنے کے باوجود اس میدان میں عاجز تھے اور سودا و ذوق کی ہم سری نہ کر سکتے تھے۔ قصیدہ گوئی کے لیے ایک خاص طرح کا ریاض، ایک خاص طرح کی مشق ضروری ہے اور غالب یہ شرط پوری نہ کر پائے۔ سودا اور ذوق نے اپنی بہترین کوششیں اس پر صرف کر دیں کہ قصیدہ گوئی میں کمال حاصل ہو جائے چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ غالب نے غزل کو اپنی جولاں گاہ بنایا اور اس میں شہرت و ناموری حاصل کی لیکن مدح طرازی کے

میدان میں غالب کا یہ عجز اردو شاعری کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ جس طرح اپنی مصروفیت اور بڑھاپے کے سبب انھوں نے فارسی کے بجائے اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے تو سہل نگاری کی بنیاد ڈال گئے۔ شاکر کو لکھتے ہیں : پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ اسی طرح غیر شعوری طور پر انھوں نے اردو قصیدہ گوئی کا بھی ایک نیا انداز ایجاد کر دیا۔ اسے جھوٹ اور مبالغے سے مکمل طور پر نہ سہی کسی حد تک نجات ضرور مل گئی۔ ان کی مدح کا انداز یہ ہے ——

مہر کا نیا چرخ چکر کھا گیا　　بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب　　اب علوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس　　اب عیارِ آبروئے زر کھلا

قصیدے کا اختتام دعا پر ہوتا ہے۔ یہ دعا برمحل، مختصر اور پر اثر ہونی چاہیے۔ غالب یہاں بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔ دعا کا نمونہ یہ ہے ——

ہے ازل سے روائیٔ آغاز　　ہوا ابد تک رسائیٔ انجام

اور

تم کرو صاحبقرانی جب تلک　　ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

ایک مدحیہ قطعے کی دعا تو ضرب المثل بن گئی ہے ——

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قصائد غالب کی زبان

باقی کلام کی طرح غالب کے اردو قصائد کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مشکل گوئی کے دور میں کہے ہوئے قصیدے پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی کا شکار ہیں۔ یہ پیرویِ

بیدل کے زمانے میں تصنیف ہوئے اور غالب کی مشکل گوئی کی یادگار ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اسی طرح کے کلام پر طنز کیا تھا کہ "کسی نے سمجھا اور کسی نے نہ سمجھا"۔ غالب کے اس کلام پر چاروں طرف سے اعتراضات ہوئے کہ "اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے" ان طنزیہ جملوں کا شروع میں تو انھوں نے بہت برا مانا اور تلخ جواب دیے —

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن آخر کار اس خامی کا اعتراف کیا، اپنے پرانے کلام کو رد کیا اور ابہام و پیچیدگی سے اجتناب کرنے لگے لیکن قصیدے کے معاملے میں وہ کچھ دنوں پرانی روش پر چلتے رہے کیوں کہ اس میدان میں ان کا براہِ راست مقابلہ ذوق سے تھا۔ ذوق کی وفات کے بعد بادشاہ نے اپنے کلام کی اصلاح پر غالب کو مامور کیا۔ بہادر شاہ کی مدح میں کہے گئے قصائد اسی دور میں تحریر ہوئے۔ ان قصائد میں وہ اپنی قدیم مشکل گوئی سے اجتناب کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ پیچیدہ اندازِ بیان نہ مغلق تراکیب، نہ ایسی تشبیہیں جن تک رسائی دشوار ہو اس لیے ان کے یہ دونوں قصیدے دل میں گھر کرتے نظر آتے ہیں۔

ان قصیدوں میں جزالت اور زورِ بیان کی کبھی کمی ہے کیوں کہ اس کے لیے پرشکوہ اور بالعموم ثقیل الفاظ کا استعمال ضروری ہے اور اب وہ اس سے دامن بچاتے ہیں۔

قصیدہ نگاری میں غالبؔ کا مقام

پامال راستوں پر چلنا غالبؔ کو گوارا نہ تھا ہر میدان میں وہ اپنا راستہ آپ نکالتے تھے۔ قصیدہ نگاری میں بھی وہ اپنی طرزِ خاص کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی تشبیب دل آویز، گریز فطری اور پرکشش ہوتی ہے۔ مدح گوئی میں وہ زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتے یا ملا سکتے نہیں لیکن ان کی مدح کسی حد تک حقیقت کے قریب اور اس لیے زیادہ پر اثر ہوتی ہے اور ان کے قصائد کے دعائیہ حصے تو آج تک زبان زد خلائق ہیں۔

منتخب کلام

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۲)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۳)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۴)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

۵

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

○

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

○

(۶)

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

(۷)

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل وجاں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۸

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

دا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۹

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۱۰)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

نینداس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(۱۱)

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

(۱۲)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

۱۳

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

۱۴

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

(۱۵)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۱۶)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۱۷)

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۱۸)

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

(۱۹)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے　　نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

۲۰

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۲۱

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی — ق — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

۲۲

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال ، نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق ہاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۲۳

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں، کہو اچھا مرے آگے

(٢٤)

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

(٢٥)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

———————

متفرق

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی، کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم !
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روشِ مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ادا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

رباعی

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

قصیدہ در مدحِ بہادر شاہ

ہاں مہِ نو، سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ — "بندہ عاجز ہے گردشِ ایام!

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام"

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص! — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام!

عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام؟

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ! — قربِ ہر روز بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام؟

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون! — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ!
لوحش اللہ عارفانہ کلام!

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے ق
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بہ موجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

مدحِ شاہ

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سرتا سر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے؛ یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیار آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح؛ ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستایش ناتمام
عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا

جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

گزارشِ مصنف بہ حضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ   اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں   تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی   ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز   روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ ازروے ننگِ بے ہنری   ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی   جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں   بادشہ کا غلام کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح   تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ گزار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر   نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں   مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں   ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر   تا نہ دے مجھ کو زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش   جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال   کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ!   بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!

آگ تاپے کہاں تلک انساں   دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وقِنا ربّنا عذاب النار!

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار!

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار؟

میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا، نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام:
(شاعری سے نہیں مجھے سروکار)

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب: مکتوب نگار

ہمارے نثری ادب میں غالب نے مکتوب نگاری کے ایسے پرکشش انداز کی بنیاد ڈالی جس کی دلفریبی آج بھی اہل نظر سے خراج تحسین وصول کرتی ہے اور یہ مقبولیت روز افزوں ہے۔ مولانا حالی تو یادگار غالب میں یہاں تک کہہ گزرے کہ مرزا کی شہرت وناموری کا دارو مدار ان کی اردو فارسی شاعری پر نہیں اردو مکتوب نگاری پر ہے۔ مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ سچ بات یہ ہے کہ غالب صرف شاعر ہوتے تب بھی اور صرف مکتوب نگار ہوتے تب بھی اردو ادب میں ان کا رتبہ وہی ہوتا جو آج ہے۔

انگریزی شاعر ملٹن کی شہرت ان کی شاعری کے سبب ہے لیکن ان کے نثر پاروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نقاد نے ان کی نثری تصنیف اریوپے جی ٹیکا کو سراہتے ہوئے کہا تھا کہ ملٹن نے فردوس گمشدہ نہ لکھی ہوتی اور ان کی صرف یہ نثری تصنیف موجود ہوتی تو بھی انگریزی ادب کی تاریخ میں ان کا رتبہ کم نہ ہوتا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی انگریزی نقاد کا یہ جملہ دہرانے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"خاکم بہ دہن اگر دیوانِ غالب نہ ہوتا اور صرف خطوطِ غالب

ہوتے تو کبھی غالب غالب ہی ہوتے۔"

غالب کو اپنی شاعری پر جتنا ناز تھا اتنا ہی اپنے خطوط پر بھی تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مکتوب نگاری کے اس نئے انداز کے موجد وہ خود ہی ہیں اور ان سے پہلے کوئی ایسے دلکش خط نہیں لکھ سکا۔ میر مہدی مجروح سے ایک خط میں سوال کرتے ہیں :-

"کیوں، سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟"

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم سے پہلے کوئی اس انداز کے خط نہیں لکھ سکا اور ایک خط میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

(خط بنام حاتم علی مہر)

عہدِ غالب تک مکتوب نگاری کے جس طرز کا رواج تھا غالب کو اس سے سخت نفرت تھی۔ ایک جگہ طنزیہ لہجے میں فرماتے ہیں کہ قدیم وضع کے لوگ اس خط کو خط مانتے ہی نہیں جس میں پرانی روش اختیار نہ کی گئی ہو بلکہ ان کے نزدیک وہ خط ایسے کنویں کے مانند ہے جس کا پانی سوکھ گیا ہو، ایسا بادل ہے جو برس نہ سکے، ایسا درخت ہے جو میوہ دار نہ ہو، ایسا گھر ہے جو چراغ سے محروم ہو اور ایسا چراغ ہے جس میں اجالا نہ ہو۔ اب ملاحظہ فرمائیے اصل عبارت :-

"ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں

ہے۔ چاہِ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے،
خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بے نور ہے۔"

جو قدیم طرزِ مکتوب نگاری سے اتنا بیزار ہو وہ کیوں اس کی پیروی کرے گا۔ دوسروں کے نقشِ قدم پر چلنا غالب کو یوں بھی گوارا نہ تھا۔ چنانچہ مکتوب نگاری کی وادی میں انھوں نے اپنا راستہ آپ نکالا اور مکاتیب کا ایسا بیش بہا ذخیرہ چھوڑ گئے جس پر اردو زبان ہمیشہ ناز کرے گی۔

اردو مکتوب نگاری کا آغاز

مغلوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان پر فارسی زبان کی حکمرانی تھی۔ یہی یہاں کی علمی زبان تھی اور اسی میں مراسلت کا دستور تھا۔ غالب بھی پہلے اسی زبان میں خط لکھا کرتے تھے۔ اردو اس وقت عام بول چال کی زبان بن چکی تھی اور اس میں شاعری بھی کی جانے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ مراسلت کے میدان میں بھی اس نے قدم جما لیے۔ آخر کار غالب نے بھی فارسی میں خط لکھنا ترک کیا اور اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔

فارسی میں نامہ نگاری کا ایک خاص انداز تھا اور اس کے لیے بہت توجہ اور کاوش درکار تھی۔ ضروری تھا کہ مکتوب سے مکتوب نگار کی علمیت اور انشاپردازی کے کمال کا اظہار ہو۔ غالب کا بیان ہے کہ بیماری اور بڑھاپے کے سبب عبارت آرائی کی ہمت نہ رہی تو وہ اردو کی طرف متوجہ ہوئے اور دل کی بات بلاتکلف زبانِ قلم سے ادا کرنے لگے۔ اس کے لیے نہ کوئی اہتمام درکار تھا اور نہ محنت کی ضرورت تھی۔ بے تکلف بات چیت کا لطف الگ حاصل ہوتا تھا۔ ایک خط

میں لکھتے ہیں :-

"زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی :-

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب   اب عناصر میں اعتدال کہاں"

مولانا حالی کا اندازہ ہے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء کے کچھ بعد اردو میں خط لکھنے شروع کیے لیکن اس سے پہلے کے لکھے ہوئے کچھ خطوط بھی دستیاب ہو چکے ہیں۔ جواہر سنگھ جوہر کے نام لکھے گئے پہلی دسمبر ۱۸۴۸ء کے خط کو مولانا غلام رسول مہر غالب کا پہلا اردو مکتوب قرار دیتے ہیں۔ خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں اس لیے مہیش پرشاد کی رائے ہے کہ اگست ۱۸۴۹ء میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا گیا خط غالب کا پہلا اردو خط ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق جلال الدین صاحب نے ۱۵ر نومبر ۱۹۷۵ء کے "ہماری زبان" میں غالب کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط کا تعارف کرایا ہے جو ۲۵ر اپریل اور ۱۳ر نومبر ۱۸۴۶ء کے درمیان لکھے گئے۔ یہ خطوط شایع نہیں ہوئے اس لیے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جلال الدین کی اطلاع کو درست مان لیا جائے تو قدامت کا سہرا ان ہی خطوط کے سر ہے۔ بہر حال اتنی بات طے ہے کہ پہلے وہ فارسی میں خط لکھتے تھے جب قویٰ مضمحل ہو گئے اور فارسی زبان میں عبارت آرائی کی کی طاقت نہ رہی تو بول چال کی زبان یعنی اردو میں قلم برداشتہ خط لکھنے لگے۔ اس کام میں دل لگا۔ دوستوں نے ان خطوں کو پسند کیا تو ان کا بشیتر وقت مکتوب

نگاری میں صرف ہونے لگا۔

مکتوب نگاری کا شوق

غالب کے اردو خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ـــــ وہ خطوط جو کسی مقصد کے تحت لکھے گئے اور وہ خطوط جو تفریح کے طور پر یعنی مکتوب نگاری کے شوق کی تکمیل کے لیے لکھے گئے۔ حساب لگایا جائے تو ان شوقیہ خطوط کا پلّہ بھاری نظر آئے گا۔ دراصل اس کام کا آغاز تو ضرورتاً ہوا تھا مگر آخر کار اس کام میں ایسا جی لگا کہ اس نے تفریحی مشغلے کی شکل اختیار کر لی۔ ایک خط میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

"میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف وجوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔"

میر مہدی مجروح سے خط لکھنے کا تقاضا ان لفظوں میں کرتے ہیں :۔

"خط لکھنے میں تردد نہ کرو اور ڈاک میں بے تامل بھیجا کرو۔"

منشی شیو نراین آرام کو لکھتے ہیں :۔

"بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر دیر سے

لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے ۔"

میرزا تفتہ کا خط آنے میں دیر ہوئی تو بے چین ہو کر یہاں تک لکھ دیا :۔

"کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں ؟ اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار جاری ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے ۔"

تفتہ ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

"یہ کیا سبب ، دس دس بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے ۔ خط لکھو صاحب ۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو ۔"

تفتہ کے نام دو اور خطوں کے اقتباس ملاحظہ ہوں :۔

"ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے ۔"

اور

"بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔"

ایک خط میں حاتم علی مہر سے شکایت کرتے ہیں :۔

"کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے ؟ اتنا تو کہو کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے ؟ برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا ۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی ، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا ۔"

غالب بلا تاخیر خطوں کا جواب دیتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے بھی اصرار

کرتے تھے کہ پابندی سے خط لکھیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق سارا دن خط پڑھنے اور جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ شعر صرف رات کے وقت عالم سرور میں کہتے تھے۔ اس عالم میں لکھنا دشوار ہوتا تھا۔ اس لیے کمربند میں گرہیں لگا لیتے تھے۔ صبح کو شعر یاد کر کے لکھتے جاتے اور گرہیں کھولتے جاتے لیکن یہ روز کا معمول نہ تھا۔ ایک مدت اس طرح گزری کہ شعر گوئی کی طرف دل مائل ہی نہ ہوا۔ صرف مکتوب نگاری کا شغل ایسا تھا جس نے ہمیشہ دل بستگی کا سامان فراہم کیا۔ خط پڑھنے اور جواب لکھنے سے جو وقت بچ رہتا تھا وہ لفافے بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ منشی شیو نراین آرام کو لکھتے ہیں :-

"لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔"

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :-

"مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا لفافے بناؤں گا۔"

لفافوں کے سلسلے میں غالب کی نفاست پسندی بھی قابلِ ذکر ہے۔ ایک بار منشی شیو نراین آرام نے کچھ لفافے بھیجے۔ ہر لفافے پر یہ عبارت چھپی ہوئی تھی کہ یہ خط کس مقام سے کس تاریخ کو روانہ کیا گیا اور اس کی منزل کیا ہے۔ غالب کو یہ لفافے پسند نہ آئے۔ ایک بار دوستوں کو بانٹ دیے۔ دوسری بار منشی جی کو لوٹا دیے۔ لفافے واپس کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آج اس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے آیا۔ دل خوش ہوا۔ بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے ازمقام و

درمقام د تاریخ و ماہ مجھ کو پسند نہیں۔ آگے جو تم نے مجھے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کے عوض یہ لفافے جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو اور اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں۔"

دیکھا آپ نے یہ ہے غالب کا مزاج۔ لباس، خوراک، کتابت، طباعت، لفافوں کا انتخاب ــــ ہر معاملے میں وہ بے حد نفاست پسند ہیں۔ انھوں نے خود ہی فرما دیا "بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔" ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ان کا کلام نظم و نثر صحت و نفاست کے ساتھ شایع ہو کر ہر طرف پھیل جائے۔

خطوط کی اشاعت

غالب نے اردو میں خط لکھنے شروع کیے تو یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ سرسری طور پر لکھے گئے یہ خط اتنی جلدی ہر طرف مقبول ہو جائیں گے اور یہ بات تو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی ہو گی کہ ایک دن احباب ان کی اشاعت کا تقاضا کریں گے۔

یہ خطوط جو بغیر کسی اہتمام و تکلف کے لکھے گئے تھے دوستوں اور عزیزوں میں بہت پسند کیے گئے، ایک دوسرے کو پڑھ کر سنائے گئے اور عزیز شاگرد اردو ادب کے اس بیش قیمت سرمایے کو محفوظ کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ غالباً منشی شیو نراین آرام نے غالب کے نام اپنے کسی خط میں ان خطوط کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ تجویز غالب کو پسند نہیں آئی۔ جواب میں لکھتے ہیں:-

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔
کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا
ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے شکوہ
کے منافی ہے۔ اس سے قطعِ نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس
کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا
جانا میرے خلافِ طبع ہے۔"

غالب نے اپنے خطوط کی اشاعت کے خلاف رائے تو دے دی لیکن اپنے پرستاروں کی رائے کے آگے سر جھکانا بھی پڑا۔ اب انھیں اپنی "تحریر سرسری" کی دلکشی کا اندازہ ہوا اور یہ بھی یقین ہوگیا کہ ایک نہ ایک دن یہ خطوط ضرور چھپ کے رہیں گے۔ اب وہ ذرا قلم سنبھال کے لکھنے لگے۔ خطوں کی دل فریبی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ ادھر شاگرد اور دوست اپنی رائے پر قایم رہے اور شاید باہمی مشورہ بھی جاری رہا۔ منشی شیو نراین آرام اور مرزا ہرگوپال تفتہ ان میں پیش پیش تھے۔ اب کی بار آرام نے نہیں تفتہ نے خط لکھا۔ جواب میں فرماتے ہیں :-

"رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی
سی ضد نہ کرو۔ اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے
نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔"

یہ تو لکھ دیا کہ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے لیکن اب وہ پگھلتے اور ہتھیار ڈالتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ جملہ کہ اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ

پوچھو تم کو اختیار ہے، صاف بتا رہا ہے کہ وہ نیم رضامند ہیں۔ یہی نہیں بلکہ رقعات کی فراہمی کی مہم کا آغاز ہوتا ہے تو وہ معاون و مددگار نظر آتے ہیں۔ اب ان کی خوشی اسی میں ہے کہ یہ خطوط چھپیں اور جلد چھپیں۔

ساری زندگی غالب کی کوشش یہ رہی کہ ان کا دیوان زیادہ سے زیادہ صحت اور بہترین طباعت کے ساتھ شایع ہو۔ اگر اپنے خطوط کی اشاعت میں انھوں نے تعاون کیا تو اس میں حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

خطوطِ غالب کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" ان کی وفات سے پونے چار مہینے قبل شایع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "اردوے معلیٰ" چھپنا تو ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن مکمل ان کی وفات کے بعد ہوا۔ رقعات کے متعدد مجموعے اس کے بعد شایع ہوئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :-

مکاتیب غالب (۱۹۳۷ء) غالب نے ریاست رام پور کے نوابین کے نام جو خطوط لکھے ان میں سے بیشتر وہاں محفوظ تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کرنل بشیر حسین زیدی کی فرمایش پر انھیں نہایت سلیقے سے ترتیب دیا اور ریاست کے خرچ پر اسے بہت اہتمام سے شایع کیا گیا۔ یہ مجموعہ ایک سو ستر خطوط پر مشتمل ہے۔

اس میں منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے گئے چوہتر خطوط شامل ہیں۔ ادارہ نادرات کراچی سے شایع ہوئے۔

نادراتِ غالب (۱۹۴۹ء) اس میں منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے گئے چوہتر خطوط شامل ہیں۔ ادارۂ نادرات کراچی سے شایع ہوئی۔

ادبی خطوطِ غالب (۱۹۳۹ء) مرزا محمد عسکری نے ایسے خطوط کو یکجا کر دیا ہے جن میں مکتوب نگار نے ادبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

خطوطِ غالب (۱۹۴۱ء) مولوی مہیش پرشاد نے غالب کے تمام خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی سے شایع ہوئی لیکن مولوی صاحب کی وفات کے سبب دوسری جلد شایع نہیں ہوسکی۔

خطوطِ غالب (۱۹۵۱ء) مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے تمام خطوط بہ استثنائے مکاتیبِ غالب و نادراتِ غالب یکجا کر کے کتاب منزل لاہور سے شایع کیے۔

غالب کے خطوط (۱۹۸۴ء) ڈاکٹر خلیق انجم نے چار جلدوں میں غالب کے تمام خطوط کو یکجا کیا ہے۔ مولانا عرشی کے بعد یہ دوسرا کام ہے جو نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے اور جس پر بہت محنت صرف ہوئی ہے۔

غالب کی زندگی میں غالب کے خطوط اس اہتمام سے شایع نہ ہوسکے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ تاہم اس زمانے میں یہ بھی غنیمت تھا کہ ایک مجموعہ ان کے سامنے شایع ہوگیا۔ دوسرا مجموعہ چھاپہ خانے میں تھا اور امید تھی کہ جلد وہ بھی منظرِ عام پر آجائے گا۔ غالب اس صورتِ حال سے مطمئن تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ بقائے دوام کے دربار میں انھیں بلند رتبہ حاصل ہوگیا۔ فرماتے ہیں:۔

"نظم ونثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا وتوانا کی عنایت واعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی وقایم رہے گا۔"

خطوطِ غالب کا تنقیدی مطالعہ

غالب کے خطوں میں کچھ ایسی جادو کی سی تاثیر ہے کہ یہ خط جس کی نظر سے ایک بار گزر گئے وہ ان کی دلکشی کا قائل ہوگیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے لکھے گئے ان خطوں کی تازگی میں آج تک کمی نہیں آئی بلکہ ان کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی تصنیف وجود میں آنے کے ساتھ ہی قبولِ عام کا شرف حاصل کرلے اور یہ مقبولیت عرصۂ دراز تک برقرار رہے۔ خطوطِ غالب کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ان خطوں کا ایک کمال یہ ہے کہ خط کسی کے نام ہو، پڑھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ مکتوب نگار ہم سے ہی محوِ گفتگو ہے : ہر اک کو یہ گماں کہ مخاطب ہمیں سے ہیں

خطوطِ غالب کی اس مقبولیت کا راز کیا ہے ؟ اس دلکشی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ آخر وہ کیا خصوصیات ہیں جنھوں نے ان خطوں کو خاص و عام میں ایسا مقبول بنا دیا کہ ان کے بغیر اردو ادب کا مطالعہ نامکمل ہے ؟ آئیے اس سوال کا جواب تلاش کریں۔

اہم خصوصیات

غالب اپنے ایک خط میں منشی شیو نراین آرام کو لکھتے ہیں " بھائی، میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں" اور مزاج ان کا یہ تھا کہ بڑے سے بڑے شاعر و ادیب کی پیروی کو کسرِ شان خیال کرتے تھے۔ ساری زندگی اپنا راستہ آپ نکالا اور سب سے الگ نکالا۔ گویا وہ بہت جدّت پسند واقع ہوئے تھے۔

جدّت پسندی

غالب کے زمانے تک مکتوب نگاری کے جس انداز کا رواج تھا اسے وہ "محمد شاہی روش" کہتے تھے۔ اس روش کو وہ بے حد ناپسند کرتے تھے اور ہمیشہ اس پر طنز کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :-

" تم کو خط نویسی کی محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ یہاں خیریت ہے، وہاں کی خیریت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا، جی خوش ہوا۔"

دیکھا آپ نے، کیسا طنز ہے اس عبارت میں۔ غالب نے مکتوب نگاری کے اس پرانے طریقے سے دامن بچایا اور اس روش سے ہٹ کر اپنا راستہ نکالا۔ ان کے خطوط کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے۔ اب اس کے ثبوت پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ القاب و آداب

اس زمانے میں دستور تھا کہ مکتوب الیہ کی خوشنودی کے لیے لمبے لمبے القاب لکھے

جاتے تھے۔ ان القاب کو نثری قصیدہ کہنا چاہیے۔ مکتوب الیہ کی جتنی تعریف ممکن تھی وہ سب شروع میں ہی کر دی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اس کا ذکر ایک فارسی عبارت میں کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں میرا طرزِ نگارش یہ ہے کہ جب کاغذ قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق کسی لفظ سے پکارتا ہوں اور کام کی بات لکھ دیتا ہوں۔ القاب، آداب، خیریت و مزاج پرسی غیر ضروری باتیں ہیں۔ انھیں قلم انداز کر دیتا ہوں۔ فارسی عبارت یہ ہے :۔

"ہنجار من درنگارش ایں است کہ چو کلک و ورق بکف گیرم مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ درخورِ حالتِ اوست درسرِ آغازِ صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زوائد است و پختگاں حشو را دفع نہند۔"

یہی بات ایک اردو مکتوب میں بھی دہرائی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ غالب نے لمبے لمبے القاب ترک کر کے مختصر القاب لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ مثلاً :۔

بھائی، میاں، برخوردار، صاحب، میری جان، مہاراج، جانِ برادر، جانِ غالب، قبلہ و کعبہ، بندہ پرور، سید صاحب۔

کہیں یہ انداز ہے :۔

یوسف مرزا ، اجی مرزا تفتہ ، میاں مرزا تفتہ ، اجی مولانا علائی ،
بعض خطوں میں لمبے لمبے القاب بھی نظر آتے ہیں جیسے :۔

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان عالی شان والا دودمان
زاد مجدکم

یا ـــ

مشفق و مہربان نواب کلب علی خاں کو غالب نیم جان کا سلام
قبول ہو ۔

اور ـــ

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ منشی ہر گوپال تفتہ ۔
میرے مہربان میری جان میرزا تفتہ سخن دان ۔

گویا بعض جگہ لمبے القاب بھی استعمال کرتے ہیں اور قافیے کا اہتمام بھی کرتے ہیں ۔ کہیں اس کا مقصد ہے مکتوب الیہ کو خوش کرنا اور کہیں یہ جتانا کہ ہم قافیہ پیمائی کے ہنر میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ۔

رنگ برنگے ان القاب و آداب کے پہلو بہ پہلو بے القاب کے خطوط بھی نظر آتے ہیں جہاں مکتوب الیہ کو مخاطب کیے بغیر وہ مدعا نگاری کا آغاز کر دیتے ہیں ۔ گویا بلا تمہید کام کی بات کہہ دیتے ہیں ۔

غرض یہ کہ غالب نے القاب و آداب کے پرانے طریقوں کو بالائے طاق رکھا اور بالکل نئے انداز کی بنیاد ڈالی ۔

۲- اپنا نام

زمانۂ قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ خط کے خاتمے پر مکتوب نگار اپنا نام لکھتا ہے اور نہ لکھے تو کیسے معلوم ہو کہ خط کس کا ہے۔

نام سے پہلے کچھ لکھنے کا دستور بھی بہت پرانا ہے۔ مثلاً آپ کا نیاز مند، آپ کا فرمانبردار بیٹا، آپ کا خادم وغیرہ۔ یہ دستور آج تک جاری ہے مگر غالب کو یہ گھسی پٹی باتیں ناپسند تھیں۔ یہاں بھی انھوں نے جدّت سے کام لیا۔

خط کے آخر میں کہیں صرف غالب لکھتے ہیں کہیں صرف اسد تو کہیں اسداللہ یا اسداللہ خاں۔ کچھ خطوں میں اپنے نام کا قافیہ ملایا ہے، اس طرح ——

جواب کا طالب غالب، اس خط کی رسید کا طالب غالب،

عافیت کا طالب غالب ، نجات کا طالب غالب ،

رحم و کرم کا طالب غالب ، مرگِ ناگہاں کا طالب غالب

ایک خط میں لکھتے ہیں: راقم اسد۔ ایک جگہ صوفیوں کا انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے: غالب علی شاہ۔ ایک اور جگہ: غالبِ بے نوا، اسد بیک رنگ۔

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔"

مولانا علائی کے نام خط میں لکھتے ہیں: "کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔" میر سرفراز حسین کے نام ایک خط میں بہت مزیدار انداز اختیار کیا ہے۔ خط کے آخر میں لکھتے ہیں: "دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے، بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔" بہت سے خط ایسے ہیں کہ اپنا نام لکھے بغیر خط ختم کر دیا ہے۔ ان کی تحریر کون نہ پہچانتا ہوگا اور انھیں کون نہ جانتا ہوگا: "ایسا بھی کوئی ہوگا کہ غالب کو نہ جانے ہے"

یہاں بھی انھوں نے اپنا راستہ سب سے الگ نکالا ہے۔

۴۔ تاریخِ تحریر

غالب اپنے خطوں میں تاریخ تحریر کا بہت اہتما[م] کرتے ہیں۔ کچھ خط ایسے بھی ہیں جن پر تاریخ در[ج] نہیں۔ لیکن عام طور پر وہ تاریخ لکھتے ہیں بلکہ اکثر تو ہجری کے ساتھ عیسوی سنہ ب[ھی] لکھ دیتے ہیں۔ اس طرح

"۱۴ر رجب المرجب ۱۲۸۱ مطابق ۱۴ر دسمبر ۱۸۶۴ء"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"آج یک شنبہ کا دن ، ساتویں فروری ۱۸۵۸ء کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی ۱۲۷۰ھ کی ہے۔"

اکثر دن کے ساتھ وقت بھی لکھتے ہیں :۔

— صبح دوشنبہ شانزدہم از مۂ ماہِ صیام ۱۲۸۱ یعنی ۱۳ر فروری ۱۸۶۵ ۔

— منگل کا دن ۲۳ر جمادی الثانی ۱۶ر دسمبر پہر دن چڑھے ۔

— ۶ر دسمبر ۱۸۶۵ کہ بدھ کا دن ہے آٹھ بجا چاہتے ہیں ۔

کسی کسی خط میں تو تاریخ کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جس دن خط ملا اسی دن جواب لکھ دیا یا جس وقت خط ملا اسی وقت جواب لکھ دیا۔

"آج دوشنبہ ۶ر رمضان کی اور ۱۵ر فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا، ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھا۔"

بعض خطوں میں اسی بات کو یوں بھی لکھا ہے :۔

"وقتِ ورودِ خط، وقتِ رسیدن خط"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"یکشنبہ ہفتم فروری ۱۸۵۸ء وقتِ رسیدن نامہ۔"

زمانۂ قدیم سے آج تک یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ تاریخ تحریر یا خط کے شروع میں لکھتے ہیں یا خاتمے پر۔ غالب کی روایت شکنی نے اسے بھی برقرار نہ رکھا۔ وہ کبھی خط کے شروع میں تاریخ لکھتے ہیں، کبھی آخر میں اور کبھی درمیان میں۔ ایک اور دلچسپ طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ کسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ بھی اور اکثر دن بھی بتا دیتے ہیں۔ مثالیں دیکھیے :۔

—— میری جان، سُن۔ پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ۔ ایک قطرہ برہم زدن مینھ نہیں تھما۔

—— کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو بڑے زور کی آندھی آئی۔

گویا تاریخ تحریر میں بھی غالب نے طرح طرح کی جدتیں کیں۔

۴۔ سلام و دعا

خط میں دوستوں اور عزیزوں کو دعا سلام لکھنے کی رسم بہت پرانی ہے۔ اس کے لیے نہ جانے کیوں ایک خاص جگہ بھی مقرر ہے۔ خط ختم ہونے کے بعد اپنا نام لکھنے سے پہلے دوستوں عزیزوں کو سلام دعا لکھ کر ایک بوجھ سا اتار دیا جاتا ہے۔ ہم کسی کا احترام کرتے ہیں تو خط کے آغاز میں اسے سلام کیوں نہیں لکھتے؟ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس کے نام کو آخر میں جگہ کیوں دیتے ہیں؟ جواب یہ کہ سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔ ایک لکیر ہے جسے سب پیٹتے چلے آئے ہیں۔

خطوط غالب کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی روشِ عام پر چلنا انھوں نے اپنی شان کے خلاف جانا۔ سلام دعا کہیں خط کے شروع میں لکھتے ہیں، کہیں درمیان میں تو کہیں آخر میں۔ اس عام سی بات کے لیے بھی ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو لطف و سرور حاصل ہو۔ میر مہدی مجروح کے نام خط کے درمیان میں کئی دوستوں کو اس طرح سلام دعا لکھتے ہیں :۔

"میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا اور شفیع احمد کو سلام کہنا، میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ بس یہ خط پڑھا دو۔"

فرسودہ طریقے کو ترک کر کے سلام دعا خط کے درمیان میں لکھا ہے اور وہ بھی دلچسپ انداز میں۔

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔ میر سرفراز حسین کے نام لکھے گئے ایک خط کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں :

"میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی، بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے، اب میں نہیں جانتا، یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے، دعا سلام کی حاجت کیا؟"

اور میر مہدی مجروح کے خط میں احباب کو اس طرح یاد کرتے ہیں :

"مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ ہاہاہا میر افضل علی صاحب کہاں ہیں؟ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا ان کو ہماری دعا کہنا۔"

۵۔ بات چیت کا انداز

خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ مکتوب دو اشخاص کے درمیان بات چیت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ضبطِ تحریر میں آجاتی ہے لیکن ہوا یہ کہ قدیم مکتوب نگاروں نے نامہ نگاری میں تصنع بناوٹ اور عبارت آرائی سے کام لیا اور اسے بے تکلفی سے محروم کر دیا جو اس کا فطری حق تھا۔ غالب نے ایسا انداز اختیار کیا جیسے دو لوگ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ گویا انھوں نے خط کو نصف ملاقات نہیں مکمل ملاقات بنا دیا اور اس پر انھیں بجا طور پر فخر تھا۔ مرزا حاتم علی مہر کو بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

"مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :۔

"بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت، مکالمت ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے

ہیں ۔ اللہ اللہ یہ دن کبھی یاد رہیں گے ۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آدھ آنہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزہ معلوم ہوتا ۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

" بھائی ! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے ، مکالمہ ہے ۔"

منشی نول کشور کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :۔

" میں نے آسان راستہ اپنا لیا ہے ۔ جو کچھ لکھتا ہوں اردو میں لکھتا ہوں ۔ نہ سخن آرائی ، نہ خود نمائی ۔ تحریر کو گفتگو بنا لیا ہے ۔"

غالب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے نامہ نویسی کو بے تکلف بات چیت بنا دیا ۔ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

—— کیوں صاحب ! روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی ؟

—— اہا ہا ، میرا پیارا مہدی آیا ۔ آؤ بھائی ، مزاج تو اچھا ہے ؟ بیٹھو

—— آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ ۔

میاں لڑکے ! کہاں پھر رہے ہو ؟ ادھر آؤ خبریں سنو ۔

ایک اور خط کا ڈرامائی انداز دیکھیے :۔

" ارے کوئی ہے ! ذرا یوسف مرزا کو بلائیو ۔ لو صاحب وہ آئے ۔"

نہ کوئی یوسف مرزا کو بلانے گیا ، نہ وہ آئے ۔ یہ سب تخیل کی کارفرمائی ہے صرف اتنی سی ہے کہ یوسف مرزا کو مخاطب کرنا منظور ہے ۔ میرن صاحب ایک خط کا آغاز اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے ۔ لکھتے ہیں :۔

" میرن صاحب کہاں ہیں ؟ کوئی جائے اور بلا لائے ۔ حضرت

آئیے ! السلام علیکم ۔ مزاج مبارک ؟

اں نہ میرن صاحب کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا ، نہ انھیں بلوایا گیا ، نہ تشریف لائے ۔ یہ مراسلے کو مکالمہ بنانے کی کوشش ہے اور کامیاب کوشش ہے ۔

مکمل ڈراما غالب کے قلم سے ایسے بھی مکاتیب وجود میں آئے جو مکمل ڈراما ہیں ۔ یہاں ہم کچھ سنتے نہیں اپنی آنکھوں کے ے پیش آتے دیکھتے ہیں ۔ اور اب دیکھیے اس کی ایک مثال :۔

" اے جناب میرن صاحب ، السلام علیکم "

" حضرت آداب "

" کہو صاحب ، اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ؟ "

" حضور ، کیا منع کرتا ہوں ۔ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں ۔ تپ جاتی رہی ہے ۔ صرف پیچش باقی ہے ۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی ۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں ۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں ؟ "

" نہیں میرن صاحب ، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں ۔ وہ خفا ہوتا ہوگا ۔ جواب لکھنا ضرور ہے ۔"

" حضرت ، وہ آپ کے فرزند ہیں ۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے ۔"

" بھائی ، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟ "

"سبحان اللہ۔ اے لو حضرت! آپ خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"

"کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جائے۔ میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔"

"میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔

سنو میر مہدی صاحب! میرا کچھ گناہ نہیں۔"

یہ خط میر مہدی کے نام ہے اور اس کا لب لباب آخری جملہ ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ تمھارے خط کے جواب میں جو تاخیر ہوئی اس کا ذمہ دار میں نہیں میرن صاحب ہیں۔ انداز ایسا اختیار کیا جیسے غالب اپنے بالاخانے کی بالکنی میں تشریف رکھتے ہیں، میرن صاحب اس طرف سے گزر رہے ہیں۔ غالب آواز دیتے ہیں۔ سلام دعا ہوتی ہے۔ پوچھتے ہیں میرن صاحب تم میر مہدی کے خط کا جواب کیوں نہیں لکھنے دیتے۔ دو چار سوال جواب میں حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ میرن صاحب چاہتے ہیں غالب کا خط میر مہدی کو اس وقت ملے جب یہ بھی ان کے پاس

ہوں تاکہ خط پڑھیں اور لطف لیں ۔ مکتوب نگار نے یہ بات خود نہیں کہی میرن صاحب کی زبان سے کہلوادی ۔ اس کوشش میں ایک مکمل ڈراما وجود میں آگیا۔

۷۔ شوخی و ظرافت

غالب کے مزاج میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی ۔ مولانا حالی نے انھیں حیوانِ ظریف کہا تو بجا کہا۔ زندگی کے آخری ایام بیماری اور ناداری میں گزرے مگر خوش مزاجی میں ذرا بھی کمی نہ آئی ۔ ان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ ملاقاتی ان سے مل کر خوش ہو جائے۔ مکتوب الیہ ان کے خط سے لطف اندوز ہو۔ گفتگو کو ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ سے پر لطف بنا دیتے تھے۔ احباب ان کے پرستار تھے، ان سے ملاقات کے خواہشمند اور ان کے مکتوب کے مشتاق رہتے تھے۔ چٹکلے، لطیفے، ظرافت آمیز باتیں ان کے خطوں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ انھوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ۱۲۷۷ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاؤں گا۔"غالب مرد" سے یہ تاریخ نکالی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ احباب و شاگرد جو خدمت کر سکتے ہیں کرلیں۔ سال گزر گیا تو ایک بے تکلف دوست نے چھیڑنے کو لکھا کہ پچھلے سال تو عام وبا بھی پھیلی مگر الحمدللہ آپ زندہ سلامت رہے۔ باتوں میں انھیں کون ہرا سکتا تھا۔ جواب میں لکھتے ہیں :۔

> "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی ۔ بعدِ رفعِ فسادِ ہوا سمجھ لیا جائے گا۔"

اسی وبا کے بارے میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :۔

"وبا کہاں تھی جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ
برس کا مرد ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے
ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا"۔

امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی مرگئی اور وہ تیسری شادی کا ارادہ کرنے لگے اس کے
بارے میں تفتہ کو لکھتے ہیں :-

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے
واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی
بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے
جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے
نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا
تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟"

کسی نے شکایتاً کہا کہ غالب روزہ نہیں رکھتے۔ اس کے بارے میں منشی نبی بخش
حقیر کو لکھتے ہیں :-

"روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں کبھی پانی پی
لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے
لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا
ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے
کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے"۔

خطوطِ غالب میں ظرافت کی ایسی دلکش مثالیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں اور

ان خطوں کی مقبولیت میں اس ظرافت نے بہت اضافہ کیا ہے۔

تعزیتی خطوط

غالب کی شوخی وظرافت کا ذکر کرنے کے بعد تعزیتی خطوط کا ذکر کرنا بہت بے جوڑ اور نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ظرافت تو ان کی سرشت میں داخل تھی کہ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے اور دل آسائی و دلجوئی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے"۔ لیکن غم کسی کا بھی ہو ان کے دل کو تڑپا دیتا ہے اور موت کسی کی بھی ہو وہ ماتم گسار نظر آتے ہیں۔ ایک انگریز مارا گیا تو حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک مکتوب میں ان کے قلم سے بے اختیار یہ جملہ ٹپک پڑا "ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے"۔ بہت سے دوست دنیا سے رخصت ہو گئے تو لکھا "ہائے اتنے دوست مرے کہ اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا"۔

غالب نے غموں کو ہنسی میں اڑانا سیکھ لیا تھا۔ اچھے دنوں کے کپڑے فروخت کرکے گزر کرنی پڑی تو فرمایا "لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں"۔ جب ہر طرف سے مصائب کا ہجوم تھا اور زندگی دشوار تھی تب بھی وہ اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ قربان علی بیگ خاں سالک کو لکھتے ہیں :۔

> "یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے،

کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضداروں کو جواب دے..... آئیے نجم الدولہ بہادر!
ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

ایسا حوصلہ مند انسان تعزیتی خطوں میں ظرافت کا سہارا لے کر پسماندگان کا غم دور کرنے کی کوشش کیسے نہ کرے گا۔ مرزا حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ کی موت پر لکھتے ہیں:۔

"ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے

جی گھبراتا ہے اور کلیجا منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حوراجیرن ہو جائے گی۔"

طرح طرح سے غم زدوں کی دلجوئی کرتے ہیں۔ میاں داد خاں سیاح کا بیٹا مر گیا تو اپنی مثال سے دلاسا دیتے ہیں کہ اکہتر برس کی عمر تک میرے سات بچے ہوئے ان میں سے کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ جیا۔ تفتہ کو کیسی پتے کی بات لکھتے ہیں کہ "صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔"

یوسف مرزا کو تسلی دینے کا یہ انداز بھی دیکھیے :۔

" اے میری جان، اے میری آنکھیں،

زہجرانِ طفلی کہ در خاک رفت
چہ نامی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا، یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت۔ نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟"

غالب نے ایسے تعزیت نامے بھی لکھے جن میں ظرافت سے کام لیا اور ایسے بھی کہ پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ غم سے پرسا دینے والے کا کلیجا پھٹا پڑ رہا ہے۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :۔

"یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔"

نواب امین الدین خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس موقعے پر غالب نے انھیں جو تعزیتی خط لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ رسمی باتیں بھی آگئیں اور دلی کیفیت کا اظہار بھی ہوگیا۔ دیکھیے :۔

"بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں — اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعاے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلتِ نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقعے پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعاے مغفرت تو میں کیا اور میری دعا کیا؛ مگر چونکہ وہ میری مربیّہ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔"

خود سوانحی عنصر

مکاتیب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ مکتوب نگار کی سوانح سے متعلق سب سے معتبر مواد اسی صنف میں ملتا ہے۔ مکتوب نگاری سے غالب کو خاص رغبت تھی۔ ابتدائی زندگی سے

قطعِ نظر ان کا سارا سارا دن اسی شغل میں بسر ہوتا تھا۔ ان کی زندگی کے جملہ حالات اور سارے واقعات ان خطوں میں بیان ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی باقاعدہ سوانح عمری تو نہیں لکھی لیکن ان خطوط سے سوانحی اقتباسات چن کر ترتیب دے دیے جائیں تو غالب کی خود نوشت تیار ہو جاتی ہے۔ کئی اہلِ قلم نے یہ خدمت انجام دی بھی ہے۔

غالب اپنے خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، میرا دادا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آیا اور فوج میں نوکر ہوا۔ آگے چل کر میرا باپ عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر آصف الدولہ کی سرکار میں پھر حیدر آباد جاکر نظام علی خاں کے یہاں اور اس کے بعد الور جاکے راجا بختاور سنگھ کی نوکری کی۔ وہاں لڑائی میں مارا گیا۔ میرا چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ اس نے پالا۔ میں آٹھ برس کا تھا کہ وہ بھی مر گیا۔ میری تنخواہ مقرر ہوئی۔ بعد غدر اس جرم میں پنشن بند ہو گئی کہ تم بہادر شاہ کے مصاحب تھے۔ تین برس کی چھان بین کے بعد یہ بحال ہوئی۔

یہ تو ابتدائی زمانے کے حالات تھے۔ بعد کے حالات مختلف خطوں میں تحریر ہوتے رہے۔ شراب نوشی کا ذکر، ایک ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھنے کا ذکر ان کے خطوں میں موجود ہے۔ باتوں کو صیغۂ راز میں رکھنا ان کی عادت نہیں مصلحتاً کہیں جھوٹ بولتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سچ بات کبھی بتا دیتے ہیں۔ لوگ بے استادا نہ کہیں اس لیے ملا عبدالصمد ہرمزد نام کا ایک استاد اپنے دماغ سے وضع کر لیا۔

آگے چل کر اعتراف بھی کر لیا کہ یہ سب میرے ذہن کی پیداوار ہے۔

زندگی کے آخری ایام آلام و مصائب میں بسر ہوئے۔ بیماری، تنگدستی اور ناقدری نے بہت تکلیف پہنچائی۔ خطوں میں جا بجا ان تینوں تکلیفوں کا ذکر ہے۔

غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں :۔

"قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے؟ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوحِ جدید کا آرزومند پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپے دیتے ہیں، نہ جواب، نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔"

چند اور اقتباسات :۔

"پایانِ عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رامپور کے ساٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امورِ عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔"

* * * *

"میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں ... حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر کیوں جیتا ہوں؟ روح میری جسم میں اب اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں! کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے

نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت!"

٭ ٭ ٭

"ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کا فکر نہ اردو کا ذکر، نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید۔ میں ہوں اور اندوہِ ناکامیِ جاوید... ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ اب اور کہاں تک رہوں گا؟ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا۔ تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا؟ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی!"

٭ ٭ ٭

"مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست نہ پائی۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدرِ ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو ننگا بھوکا نظر

نہ آئے .... میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

دہلی کے حالات

عہدِ غالب کی دہلی کو اور وہاں پیش آنے والے واقعات کو ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان واقعات نے وقت کے دھارے کا رخ موڑ دیا اور تحریک آزادی کا راستہ ہموار کر دیا۔ مغل سلطنت کا سورج غالب کی آنکھوں کے آگے ڈوبا۔ انگریزوں کے اقبال کی صبح ان کی نظروں کے سامنے طلوع ہوئی۔ انھوں نے سب کچھ دیکھا، بہت کچھ جھیلا بھی۔ غالب بہت سمجھ دار انسان تھے مصلحت کا دامن انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ چاہتے تو ۱۸۵۷ء کی قیامت کا آنکھوں دیکھا حال پوری تفصیل کے ساتھ لکھ سکتے تھے مگر جانتے تھے اس میں جان کا خطرہ ہے۔ تفتہ کے نام خط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔ پھر بھی ان خطوں میں نہایت اہم معلومات محفوظ ہو گئی ہیں۔

۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں۔ امیر غریب سب (دہلی سے) نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست (یعنی سزا) پاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست (مارشل لا) ۱۱ رمئی سے آج تک یعنی پنجم دسمبر تک بدستور ہے۔ باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ (اجازت نامہ) اندر نہیں آنے پاتا۔ ایک خط میں

لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے جاگیردار پکڑے ہوئے ہیں، بڑے بڑے رئیس پابہ زنجیر دہلی لاکر زنداں میں ڈالے گئے۔ بڑے دکھ کے ساتھ لکھتے ہیں۔" واللہ ڈھونڈے مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔"

خود غالب بھی بازپرس سے نہیں بچے۔ پہلے تو ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم نے سکہ کہا یعنی مطلب یہ کہ بہادر شاہ کی تاج پوشی پر شعر کہے۔ آخر کار اس الزام سے بری ہوئے۔ پنشن اس جرم میں بند ہوئی کہ تم بادشاہ کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ بالآخر پنشن بحال ہوئی۔ غالب نے لکھا ہے کہ انگریز افسروں کی عدالتیں من مانی کرتی تھیں۔ کوئی قانون قاعدہ نہ تھا جسے چاہا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جسے چاہا بخش دیا۔

نہ لکھنے پر بھی غالب نے ۱۸۵۷ء کے بارے میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ بھی پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس زمانے میں غالب کو سب سے بڑا غم تنہائی کا تھا۔ بہت سے دوست اور عزیز مر گئے۔ جو زندہ تھے وہ ان سے اور ان کی دلی سے دور تھے۔ غالب انھیں برابر یاد کرتے تھے اور خطوط میں بڑے درد آمیز انداز میں ان کا ذکر کرتے تھے۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:-

" وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے

کچھ گئے ہیں ۔ اللہ اللہ اللہ ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں ۔ میں
مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟"

وہ ایک انسان دوست ہیں کہ اپنوں بیگانوں سب کے غم میں شریک ہیں۔ انھیں صرف اپنے ہم وطنوں کی موت کا غم نہیں انگریزوں کی موت پر بھی وہ سوگوار نظر آتے ہیں :-

" انگریز کی قوم سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ معشوق ۔ سب کے سب خاک میں مل گئے ۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو ۔ ہائے ، اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا ۔"

غالب کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں دہلی پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی اور وہاں کے رہنے والوں پر کیا گزری تھی ۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کی نظر سے نہیں بچیں ۔ دکانوں کا منہدم ہونا ، کنووں کا بند کیا جانا ، سڑکوں کا چوڑا ہونا سبھی کچھ انھوں نے لکھ دیا ہے لیکن انگریزوں کے مظالم کی داستان پوری طرح بیان نہیں ہوئی ۔ دار و گیر کا خوف نہ ہوتا تو ۱۸۵۷ کی دہلی کا حال ان سے بہتر کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا ۔

⁂ ⁂ ⁂

اوپر جن خصوصیات کا ذکر ہوا بے شک انھوں نے خطوطِ غالب کو ہماری زبان کے نثری ادب میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا لیکن وہ شے جس نے انھیں اردو ادب کا لافانی شاہکار بنا دیا وہ مکتوب نگار کا حسنِ بیان ہے اور اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو ضروری ہے۔

حسنِ بیان

خطوطِ غالب میں ایک نہیں نثر کے کئی روپ نظر آتے ہیں اور ہر ایک ایسا جاذبِ نظر کہ بار بار پڑھیے اور لطف لیجیے۔ کہیں سادہ و سہل اسلوب اختیار کرتے ہیں، کہیں رنگینی و رعنائی سے بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ استعارہ و تشبیہہ کا استعمال کرتے ہیں۔ کسی خط میں مقفیٰ عبارت نظر آتی ہے۔ کہیں خالص علمی نثر ہے، کہیں استدلالی انداز اپنایا گیا ہے۔ کہیں افسانے کا رنگ ہے تو کہیں ڈرامے کا۔ ذیل میں ان خصوصیات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

سادگی

سادگی کا اپنا ایک حسن ہے۔ کبھی کبھی سادگی ایسی پرکشش ہوتی ہے کہ ہزار بناؤ سنگھار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ غالب کا طریقہ یہ تھا کہ قلم اٹھایا اور خط لکھنا شروع کر دیا۔ نہ موضوع کی تلاش، نہ لفظ کی جستجو۔ کوئی معمولی قلمکار ہو تو اندیشہ ہے کہ بے مزہ پھیکی پھسپھسی نثر وجود میں آئے لیکن مصنف زبان پر قدرت رکھتا ہو تو اس کا اندیشہ نہیں۔ غالب کا یہی معاملہ ہے۔ ان کی قلم برداشتہ نثر میں بھی ایسی دل کشی ہے کہ معمولی درجے کا مصنف

ہزار بار صیقل کرنے اور نوک پلک سنوارنے کے باوجود ایسی نثر لکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ ایک خط میں مکتوب الیہ کو دعا دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مر جاؤں۔" دعا بے اختیار دل سے نکلتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ یوسف مرزا کے نام تعزیت نامہ اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

"خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔"

اس عبارت پر غور کیجئے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ انھیں پڑھیے تو خوش آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا مکمل سمفنی ہے۔ نظم وہ کامیاب ہے جسے گایا جاسکے اور نثر وہ کامیاب ہے جسے اونچی آواز میں پڑھیے تو کانوں کو اچھی لگے اور لطف حاصل ہو۔

علاء الدین علائی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انھوں نے غالب سے تاریخی نام کی فرمائش کی۔ غالب نے جواب میں لکھا کہ میں نے اپنے بیٹے کا تاریخی نام نظم کر دیا تھا۔ وہ مرگیا۔ یہ میری نحوست نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کہہ کر تاریخی نام نکالنے کو منع کر دیا۔ ممکن ہے کہ یہ بہانہ ہو مگر دلیلیں ایسی ہیں کہ قایل ہونا پڑتا ہے۔ انداز شگفتہ ہے اور اس شگفتگی کی تہ میں ہلکی سی ظرافت کار فرما ہے جس سے ذہن لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس سادگی میں کبھی بڑی دلکشی ہے۔ اب ملاحظہ

فرمائیے اصل عبارت :-

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کر کھاتے ہیں۔ تم سخن ور ہو گئے۔ حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرِ غم زدہ دل کو تکلیف دو؟ علاءالدین خاں! تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین خاں حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے، واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔"

رنگینی

غالب شاعر ہیں اور نثر میں بھی حسبِ ضرورت شعری وسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ کہیں استعارہ و تشبیہ سے کام لیتے ہیں کہیں پیکر تراشی سے۔ قافیہ آرائی کی مثالیں بھی بے شمار ہیں۔ رعایت لفظی کے استعمال سے بھی نہیں چوکتے لیکن اس صنعت کے استعمال میں وہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔ گویا ان خطوط میں سادگی و رنگینی کا دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ کہ کہیں تصنّع یعنی بناوٹ کا گمان کبھی نہیں گزرتا۔

زندگی کے آخری ایام ہیں۔ زندگی کا سورج ڈوبنے کو ہے۔ اس وقت ایک خط میں اپنے لیے "چراغِ دمِ صبح" اور "آفتابِ سرِ کوہ" کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ نواب انوارالدولہ سعدالدین خاں شفق کو لکھتے ہیں :۔

"نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ اللہ، دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے۔ دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

"دریا سارا تیر چکا ہوں" کا مطلب ہے کہ ساری زندگی گزار چکا ہوں۔ "ساحل نزدیک ہے" سے مراد یہ کہ موت کے دن دور نہیں۔ "بیڑا پار ہے" یعنی جلد موت کی آغوش میں جا سوؤں گا۔ یہ سب استعاراتی اندازِ بیان ہے۔

میاں داد خاں سیاح کے نام ایک خط میں اسی استعاراتی انداز میں اپنے بڑھاپے اور بیماری کا ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ خط کیسی تاثیر سے لبریز ہے :۔

"ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکمّا کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی —— رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا گیا تو خیر ورنہ دوزخِ جاوید

ہے اور ہم ہیں ۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے "

رکاب میں پاؤں ، باگ پر ہاتھ ، سفرِ دور و دراز ، زادِ راہ ، خالی ہاتھ ، یہ سب استعارے ہیں ـــــ سادہ اور سہل مگر بے حد دلکش !

ایک خط میں ضعف و ناتوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" حواس کھو بیٹھا ، حافظے کو رو بیٹھا ۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے "۔

یہاں آہستہ آہستہ اٹھنے کو قد آدم کی اونچائی تک دیوار تعمیر ہونے سے تشبیہ دی ہے ۔ غالب کے زمانے میں چھوٹی اینٹوں کا استعمال ہوتا تھا جو لکھوری اینٹیں کہلاتی تھیں ۔ نتیجہ یہ کہ دیوار چننے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا ۔ کیسی مکمل تشبیہ ہے ۔

" حواس کھو بیٹھا ، حافظے کو رو بیٹھا " ـــــ یہاں قافیے کا اہتمام کیا ہے جو لطف دے رہا ہے ۔

مرزا تفتہ کا دیوان " سنبلستاں " شایع ہوا ۔ انھوں نے ایک جلد استاد کی نذر کی ۔ غالب کو کتابت و طباعت پسند نہ آئی ۔ انھیں رمزیہ انداز میں لکھتے ہیں :۔

" اجی مرزا تفتہ تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا ۔ ہائے کیا بری کاپی ہے ۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے ۔ بیگماتِ قلعہ کو چلتے

پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستاں ایک معشوقِ خوب رو ہے مگر بدلباس۔"

اس کتاب کو معشوقِ خوب رو مگر بدلباس اس لیے کہا کہ کلام عمدہ ہے مگر جس کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شایع ہوئی وہ خراب ہے۔ یہ استعارہ ہوا۔ اس کتاب کو قلعے کی بیگمات سے تشبیہ دی گئی کیوں کہ وہ ہیں تو خوبصورت مگر لباس خراب خستہ ہے، جوتیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔

مرقع کشی شاعر لفظوں سے اپنے کلام میں کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ یہ شاعری کا بہت بڑا کمال ہے۔ اس کمال کا مظاہرہ نثر نگاری میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ غالب نے ان خطوں میں جہاں اور شعری تدبیروں سے کام لیا ہے وہیں تصویر کشی کا کمال بھی دکھایا ہے۔ اس کی اچھی مثال ایک تو وہ خط ہے جس میں سرفراز حسین کو لکھتے ہیں کہ: "وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔" تصور کا عالم ہے۔ ایک ایک دوست کو آتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

ایک خط میں اپنی مضحکہ خیز تصویر ان لفظوں میں کھینچتے ہیں۔ مضحکہ خیز تو کیا اسے دردناک کہنا چاہیے۔

"آئیے نجم الدولہ بہادر۔ ایک قرضدار کا گریباں میں ہاتھ۔ ایک بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب

یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟"
میر مہدی کے نام ایک خط میں ان کے ایک دوست کی لفظوں میں ایسی تصویر کھینچتے ہیں لگتا ہے کہ وہ جیتے جاگتے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے :۔

"کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، داڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے ۔ تمھارا خط دیا صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا حکیم نکلے یعنی حکیم میر اشرف علی ۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں ۔"

قافیہ آرائی

قافیے کا اصل تعلق تو شاعری سے ہے لیکن نثر میں بھی اس سے کام لیا جاتا رہا ہے بلکہ ہمارے قدیم نثر نگاروں نے قافیہ بندی کو ہی نثر نگاری کا کمال سمجھ لیا اور مقفیٰ عبارت کا دور دورہ ہو گیا۔ مقفیٰ کا مطلب ہے وہ عبارت جس میں قوافی کا اہتمام کیا گیا ہو مقفیٰ عبارت کا لکھنا ہی کچھ کم دشوار نہ تھا کہ اس پر مسجع کی شرط بھی لگا دی گئی ۔ سجع کے معنی ہیں وزن۔ جس عبارت کے فقروں میں وزن یعنی سجع کا اہتمام کیا جائے وہ مسجع کہلاتی ہے ۔ مثلاً

"مشفق و مہربان ، نواب کلب علی خان کو غالب نیم جان کا سلام قبول ہو۔"

اس قافیہ پیمائی نے نثر نگاری کو ایک مشکل فن بنا دیا ۔ مطلب یہ کہ نثر میں کچھ لکھو تو

مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھو اور یہ کام بس کا نہ ہو تو نثر نگاری سے دور رہو۔
غالب تو شاعری کو بھی قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی کہتے ہیں۔ وہ اسے نثر کا زیور کیسے سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے اسے ترک کر کے صاف، سادہ اور سلیس زبان میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا۔ ان خطوں میں جا بجا مقفیٰ عبارتیں ملتی ہیں مگر کہیں تفریحاً، کہیں مکتوب الیہ کو خوش کرنے کے لیے اور کہیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دیکھو ہم اس فن میں بھی طاق ہیں۔ یہ استعمال ایسا ہے کہ اکثر لطف دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں ہم نے عنوان قافیہ پیمائی نہیں بلکہ قافیہ آرائی رکھا ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں قوافی سے اپنی نثر کو سجایا ہے۔ دو چار فقرے مقفیٰ لکھے اور سہل نگاری کے اپنے مخصوص انداز میں خط کو مکمل کر دیا۔ یہاں قافیہ آرائی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

"اہاہا، میرا پیارا مہدی آیا۔ مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔"

ث ث ث

"ہزارہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔"

تفتہ کو لکھتے ہیں:-

"رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے مگر چونکہ تحکم و کارفرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور

چار جلدیں یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔"

چند اور مثالیں :-

"نہ تم مجرم نہ میں گنہ گار، تم مجبور میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔"

٭ ٭ ٭

"خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔"

٭ ٭ ٭

"بھائی یہاں کا نقشہ کچھ اور ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔"

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے قافیوں کا استعمال تو کیا مگر اپنے اندازسے۔ تھوڑا بہت منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دو چار سطریں اس طرح کی لکھیں پھر اپنے اصل رنگ پر آگئے۔ ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے کہ ہر میدان میں اپنا راستہ سب سے الگ نکالتے ہیں۔

افسانویت بعض خطوں میں غالب نے افسانوی انداز اختیار کیا ہے۔ اس کی مثالیں کم ہیں مگر ہیں بہت دلکش۔ کئی جگہ واقعات بالکل اس طرح سنائے ہیں جیسے کوئی کہانی سنا رہے ہوں۔ ایک خط میں اپنی زندگی کی پوری کہانی بیان کی ہے۔ اس کہانی میں شروع سے آخر تک استعارہ وعلامت کا استعمال کیا گیا ہے۔ علاء الدین علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔"

یہاں بیڑی سے مراد بیوی ہے۔ عارف کے دو بیٹے غالب کے ساتھ رہتے تھے، انھیں ہتھکڑیاں کہا ہے۔ اس خط میں متعدد علامتوں کا استعمال ہوا ہے جو ذرا سا غور کرنے سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ اسے تمثیلی انداز کہنا مناسب ہوگا۔

ڈرامائیت

غالب کے خطوط میں جا بجا ڈرامائی انداز نظر آتا ہے۔ بعض مکاتیب تو مکمل ڈراما ہیں۔ مکتوب نگار کا یہ دعویٰ کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے بالکل درست ہے۔ خطوطِ غالب میں اس کی مثالیں

بے شمار ہیں۔ بہت سے خطوط کا تو آغاز ہی ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے۔ مکتوب الیہ کو اکثر اس طرح مخاطب کرتے ہیں جیسے اسے آواز دے کر بلاتے ہیں یا بلواتے ہیں جیسے : "ارے کوئی ہے ؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو ـــــ لو صاحب وہ آئے" میر مہدی مجروح کے نام غالب کا خط جو اس طرح شروع ہوتا ہے جیسے میرن صاحب سے محوِ کلام ہوں اور گماں گزرتا ہے کہ یہ خط میرن صاحب کے نام ہے اس کی بہترین مثال ہے۔ اس خط کا پہلا جملہ ہے : اے جناب میرن صاحب ! السلام علیکم "

یہاں دو اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ غالب فرماتے ہیں کہ محمد علی بیگ آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں یا ابھی نہیں :۔

"کیوں بھئی محمد علی بیگ ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں ؟"

"حضرت ابھی نہیں "

"کیا آج نہ جائیں گی ؟"

"آج ضرور جائیں گی ۔ تیاری ہو رہی ہے "

نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"پیر جی سے جب پوچھتا ہوں : تم خوب شخص ہو ؟

اور وہ کہتے ہیں : کیا کہنا ہے ۔

میں پوچھتا ہوں : کس کا ؟

تو وہ فرماتے ہیں : مرزا شمشاد علی بیگ کا "

ایں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے ؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہیرا سنگھ موجود ہے۔

واہ صاحب، میں کیا خوشامدی ہوں جو منھ دیکھی کہوں۔"

علمی نثر اردو نثر کے فروغ میں تین بزرگوں کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ یہ ہیں: میرامن، غالب اور سرسید۔ یہ خیال عام ہے کہ میرامن کی نثر قصہ کہانی سنانے سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غالب کی زبان خیریت گوئی اور عافیت جوئی کے سوا اور کسی کام نہیں آسکتی۔ علمی نثر کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا سرسید کے سر ہے، مگر یہ خیال درست نہیں۔ غالب کے خطوط میں ہر طرح کی نثر کے اوّلین نقوش نظر آجاتے ہیں۔

علمی نثر سے مراد وہ زبان ہے جس میں ہر طرح کے علمی مضامین ادا کیے جاسکیں اور ہر طرح کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جاسکے۔ خطوطِ غالب میں علمی نثر کی مثالیں جگہ جگہ موجود ہیں۔ انھوں نے بہت سے خطوط میں علمی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ ایسے موقعوں پر علمی نثر وجود میں آئی۔ اپنے متعدد اشعار کی وضاحت کی ہے اور ان کی باریکیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

اس شعر کی بابت لکھتے ہیں:۔

" مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں۔ داد دینا حسنِ عارض اور حسنِ ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے اور

گمان اس کا صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیرِ غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے؟ حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ ہوسناک آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔"

یہ خالص علمی نثر کا نمونہ ہے۔

استدلالی نثر

استدلالی نثر علمی نثر کا ہی ایک روپ ہے۔ مراد یہ کہ جو دعویٰ کیا جائے اسے دلیلوں سے ثابت کر دیا جائے۔ اسے استدلالی نثر کہتے ہیں۔ سرسید نے اس سے بہت کام لیا۔ اپنی رائے کی تائید میں انھیں بار بار دلیلیں پیش کرنی پڑیں اس لیے استدلالی نثر کا موجد انھیں ہی سمجھا جائے گا۔ اس نثر کو عام کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا نقشِ اوّل پہلی بار غالب کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ خط پیش کیا جا سکتا ہے جو نواب ضیاءالدین احمد خاں کے نام لکھا گیا ہے۔ غالب ان سے دیوان مستعار مانگتے ہیں اور دلیلیں دیتے ہیں کہ تمھارے لیے اس کا دینا کیوں مناسب ہے۔ پھر طرح طرح یقین دلاتے ہیں کہ اسے واپس کر دیا جائے گا۔ غالب کی دلیلیں ملاحظہ ہوں :۔

"آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو یہ بھی

نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے ؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں ؟

رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی ؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلّی اور لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخرالدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے ؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں ؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا ؟ پہلے تو ناتمام پھر ناقص تیسرے یہ کہ سراسر غلط ہر شعر غلط۔ ہر مصرع غلط۔

یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔"

پورے خط میں دلیلیں موجود ہیں۔ پہلے پیراگراف پر غور کیجیے۔ دیوان نہ دینے کا سبب پوچھتے ہیں۔ کہتے ہیں ایسا تو نہیں کہ روز آپ کے مطالعے میں رہتا ہو اور

اسے دیکھے بغیر آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو۔ پھر دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں کہ اس کا چھپنا بہر حال مفید ہے۔ ایک جلد کی ہزار جلدیں بن جائیں گی میرا کلام ہر طرف مشہور ہو گا۔ اس سے مجھے خوشی ہو گی۔ تمھاری تعریف میں جو قصیدہ میں نے کہا ہے اسے دنیا دیکھے گی۔ اس طرح دلیلوں سے مکتوب الیہ کو قایل کر دیتے ہیں کہ دیوان مستعار دینے میں اس کا کوئی نقصان نہیں بلکہ ہر طرح فائدہ ہی ہے خطوطِ غالب میں استدلالی نثر کے نمونے دو ایک جگہ اور کبھی نظر آتے ہیں اردو میں اس اندازِ نثر کے نقاشِ اوّل بلاشبہ غالب ہیں۔ اسے فروغ دینے اور عام کرنے کا سہرا بے شک سر سید کے سر ہے۔

٭ ٭ ٭

غالب کے خطوط ہمارے ادب کا لافانی شاہکار ہیں۔ صرف وہی ادب پارہ شہکار کہلانے کا مستحق ہے جس پر کم سے کم ایک صدی گزر چکی ہو اور اس کی مقبولیت میں کمی نہ آئی ہو۔ کتابیں اپنی تخلیق کے کافی بعد قارئین تک پہنچتی ہیں اور ان کی پسند و ناپسند کی کسوٹی پر کسی جاتی ہیں۔ خط خواہ اہم ہو یا غیر اہم، کم سے کم ایک قاری یعنی مکتوب الیہ تک بلاتاخیر پہنچ جاتا ہے اور اس پر قاری کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی مہر لگ جاتی ہے۔ غالب کا خط جب کسی مکتوب الیہ تک پہنچتا تھا تو وہ اسے ایک انمول سوغات سمجھ کر آنکھوں سے لگاتا تھا، عزیزوں دوستوں کو دکھاتا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کرتا تھا۔ غالب کے خطوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ مقبولیت آج تک برقرار ہے۔ اس کے باوجود بعض علمائے ادب کو شکایت ہے کہ یہ خطوط جتنی توجہ

کے مستحق تھے اتنی توجہ ان کی طرف نہیں کی گئی۔

مولانا غلام رسول مہر کا ارشاد ہے کہ غالب کے اردو خطوط اعلیٰ درجے کی نثر نگاری کا ذوق پیدا کرنے میں بے حد معاون ہو سکتے تھے کیوں کہ ان میں ہر طرز اور ہر رنگ کی تحریریں موجود تھیں مگر ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جو لیا جا سکتا تھا۔ فرماتے ہیں :۔

"تعجب ہے کہ انھیں رسمی خطوط سمجھ لیا گیا اور اس لحاظ سے نہ دیکھا گیا کہ ان میں صحیح مذاقِ نگارش کی پرورش کے کتنے جوہر موجود ہیں۔ وہ اگر محفوظ رہے تو زیادہ تر اس لیے کہ ایک باکمال اور شہرۂ آفاق شاعر کے تبرکات تھے اس لیے نہیں کہ بجائے خود محفوظ رہنے اور فروغ پانے کے حقدار تھے۔"

پروفیسر آل احمد سرور کا ارشاد ہے :۔

"غالب کے خطوط سے جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے ــــ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ خواہ شبلی ہوں یا ابوالکلام غالب کے خطوں کا جواب اب تک نہ ہو سکا۔"

جدید اردو نثر کی تشکیل میں میر امن کے بعد دوسرا اہم نام غالب کا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی فرومایہ زبان کو جو قصہ کہانی سنانے پر کبھی پوری طرح قادر نہ تھی ایسی توانائی عطا کی کہ وہ پیچیدہ خیالات ادا کرنے اور مشکل علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کرنے کے قابل ہو گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد سرسید کے قلم نے اس زبان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی ہم سری کر سکے۔

اردو زبان کو فروغ دینے کے علاوہ ان خطوط کا یہ کارنامہ کچھ کم اہم نہیں کہ ایک شہرۂ آفاق شاعر کی رنگا رنگ شخصیت ان صفحات میں سمٹ آئی ہے۔

سچ کہا گیا ہے کہ شاعری شخصیت کا اظہار نہیں، اس سے فرار ہے۔ مطلب یہ کہ شعر شاعر کے چہرے پر نقاب ڈال دیتا ہے اسے اٹھاتا نہیں۔ خط ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو اس نقاب کو ہٹا سکتا ہے۔ یہ خطوط نہ ہوتے تو غالب کی پہلودار اور پر پیچ شخصیت کبھی ہم پر منکشف نہ ہوتی۔ ان خطوط کی یہ خصوصیت بھی نہایت اہم ہے کہ ان میں غالب کا عہد، عہد غالب کی دم توڑتی ہوئی تہذیب، اس تہذیب کی راکھ سے جنم لیتی ہوئی ایک نئی دنیا اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہے۔

یہ خطوط ہمارے لیے سرمایۂ انبساط بھی ہیں اور ذخیرۂ معلومات بھی۔

انتخابِ مکاتیب

مکاتیب بہ نام

① بنام منشی ہرگوپال تفتہ

کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس دن بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب، نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو، ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار ۲۷ر دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

۲ بنام منشی ہرگوپال تفتہ

میاں،

تمھارے انتقالاتِ ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضایع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بیرنگی میں گزر پاؤں جس سنّاٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا۔

روز ورود نامہ بعد خواندن نوشتہ شد یک شنبہ۔

از غالب

(۳) بنام منشی ہرگوپال تفتہ

صاحب، تمھارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراد سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچّوں کو پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقیّد، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت، جو تقریر ہے بہ سبیلِ حکایت۔ بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یک شنبہ ۱۹ ر دسمبر ۱۸۵۸ء   غالب

(۴) بنام منشی ہرگوپال تفتہ

اجی مرزا تفتہ،

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں

ہوتے، بیگماتِ قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دوہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستاں" ایک معشوقِ خوب رو ہے، بدلباس ہے۔

بہرحال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلّم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔

مرقومہ صبح سہ شنبہ ۱۹؍ ماہِ اپریل ۱۸۶۱ء   غالب

⑤ بنام منشی ہرگوپال تفتہ

بھائی،

تم سچ کہتے ہو کہ بہت سے مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان کتابیں اٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مکان مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔ نواب صاحب کی غزلیں اور

تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے .... میں ناتواں بہت ہوگیا ہوں گویا صاحبِ فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی مودت کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ۔

صبحِ جمعہ ۱۴ ماہِ اکتوبر ۱۸۶۴ء　　　　غالب

(۶) بنام میر مہدی مجروح

ہاں صاحب، کیا چاہتے ہو؟ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا، جی خوش ہوا۔

..... کیوں سچ کہیو۔ اگلوں کے خطوں کی تحریر کی یہی طرز تھی؟

ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے۔ چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟

یکم شنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء　　　　غالب

⑦ بنام میر مہدی مجروح

اہاہا، میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی۔ مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو، یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے، جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی، آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

تمہارا خط پہنچا۔ تردد عبث، میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست۔ نہ عرف لکھنے کی حاجت، نہ محلے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجیے اور جواب لیا کیجیے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں، دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

فروری ۱۸۶۰ء　　　　　　　　ازغالب

⑧ بنام میر مہدی مجروح

اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم

حضرت آداب

کہو صاحب، اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔

حضور، میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔

نہیں میرن صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضروری ہے۔

حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

سبحان اللہ، اے لو حضرت۔ آپ خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔

کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جائے۔ میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔

سنو میر مہدی صاحب، میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہو گئی۔ پیچش رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا خیال رکھا کرو۔ یہ بری بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہو گا۔

اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینھ آیا۔ اب مینھ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

مئی ۱۸۶۱ء غالب

۹ بنام مرزا حاتم علی مہر

مرزا صاحب،

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔

میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور!

بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔

غالب

(۱۰) بنام مرزا حاتم علی مہر

میرزا صاحب،

آپ کا غم فزا نامہ پہنچا، میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبّت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔

سنو صاحب، شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔

کبھی، مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اسی کو مار رکھتے ہیں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔

چالیس برس کا یہ واقعہ ہے بانکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑ دو۔

غالب

(۱۱) بنام مرزا حاتم علی مہر

مرزا صاحب،

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے، اتنا تو کہو کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔

.... میرا کلام میرے پاس کچھ کبھی نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے، جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنا

کلام دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غزل

درد منت کش دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(پوری غزل لکھی ہے)

(۱۲) امین الدین خاں کی والدہ کے انتقال پر

بھائی صاحب،

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے بارے میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں ـــــ اظہارِ غم، تلقینِ صبر اور دعائے مغفرت۔ تو اظہارِ غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ممکن نہیں کسی دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے اور رہی دعائے مغفرت تو میں کیا اور میری دعا کیا لیکن چونکہ وہ میری مربیہ اور میری محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔

غالب

۱۳ بنام یوسف مرزا

یوسف مرزا،

کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ۔

مرقومہ شنبہ ۲۷ شوال ۱۲۷۶ھ ۱۹ مئی سال حال ۱۸۶۰ء

غالب

۱۴ بنام یوسف مرزا

یوسف میرزا،

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو

کہ غم کیا ہے ؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہلِ شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا انیس برس کا بچہ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا ؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں ؟ غمِ فراق: حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب۔ خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ۔ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مرگیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچّے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز۔ یہ باہر، مداری کی جورو بچے بدستور۔ گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔

ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے کو موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعفِ قویٰ اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔

.... رنج و راحت، ذلت و عزت جو مقسوم میں ہے وہ پہنچ جائے اور پھر علی علی کہتا ہوا ملکِ عدم کو چلا جاؤں۔

دوشنبہ دوم جمادی الاوّل ۱۲۷۶ھ ۲۸ نومبر ۱۸۶۰ء وقت صبح

(۱۵) بنام علاء الدین احمد خاں علائی

لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ ان کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے۔ کل ان کی چھٹی ہو گئی، آپ شریک نہ ہوئے۔

میاں، خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں۔ اللہ اس کو جیتا رکھے، اس کا داغ مجھ کو نہ دکھائے۔ یارب اس کو صحت دے، یارب اس کی عمر بڑھا دے۔ تین بچے، ایک اب پیدا ہونے والا ہے۔ یارب

اس کو اس کی اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔

۷ رشعبان ۱۲۸۱ھ نجات کا طالب
۵ رجنوری ۱۸۶۵ء غالب

(۱۶) بنام علاء الدین احمد خاں علائی

جانِ غالب،

تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو ونما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے۔ رہی دید وا دید اس کی دو صورتیں ہیں۔ تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور، خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح اور ایک عالمِ آب و گل، حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ (آج کس کی حکومت ہے) اور پھر جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّار (اللہ کے لیے جو کہ واحد اور بڑا قاہر ہے)۔

ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے

حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ (۱۲۷۷ھ) میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعدِ نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

(مبارک ہے وہ دن جب میں قید خانے سے چلا جاؤں گا اور اس ویران وادی سے اپنے شہر کی طرف جاؤں گا۔)

(۱۷) بنام علاء الدین احمد خاں علائی

میری جان،

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تمھاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمھاری طرزِ تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تا کہ احتمال رفع ہو۔ خط ثاقب کے نام کا، توبہ توبہ خط کاہے کو، ایک تختہ کاغذ کا۔ میں نے سراسر پڑھا۔ لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ فحوائے عبارت سے جگر خون نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم جدا۔ ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور اور ایسا عیار طرار، یوں عاجز و درماندہ و از کار رفتہ ہو جائے۔ تمھارا غم جدا۔ سا غرِ اوّل و درد۔ کیا دل لے کر آئے، کیا زبان لے کر آئے، کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے، کسی شیوے کی داد نہ پائی۔

بھائی اس معرض میں میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں اگرچہ یک فنہ ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست نہ پائی۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا،

کبھی مصر میں جا ٹھہرا کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ | نہ دستاں سرای، نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط | نہ غوغائی رامش گراں در رباط

(نہ صحنِ چمن ہے، نہ کوئی داستاں سنانے والا ہے نہ محبوب۔ نہ میرے فرش پر پریوں والے جسم کا ناچ ہو رہا ہے۔ نہ میرے کوٹھے پر گانے والے گانا گا رہے ہیں۔)

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفے میں تھا۔ تمھارا خالق تمھاری اور تمھارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطعِ نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

صبحِ دوشنبہ شانزدہم از مہ صیام ۱۲۸۱ھ یعنی ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

(۱۸) بنام علاء الدین احمد خاں علائی

مولانا نسیمی،

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔

جب وہ جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرِ غم زدہ دل کو تکلیف دو۔

علاء الدین خاں، تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین خاں حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے۔ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسمِ شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے، بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوطِ فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ

ولایت کے آئے ہوئے۔ صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوں کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی۔ اہلِ حرفہ سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی اور میرا نام لکھ دیا کیجیے خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

پنجشنبہ ۴ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء غالب

(۱۹) بنام علاء الدین احمد خاں علائیؔ

میری جان،

سن پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ۔ یک مژہ بر ہم زدن مینھ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ ... میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھہ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں، ہائے دبی، ہائے مری! دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹہ برسے تو چھت چار گھنٹہ برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے مینھ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک

بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالانِ زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک بہ مروت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

صبح یکشنبہ ۱۸ر جولائی ۱۸۶۲ء غالب

(۲۰) بنام قربان علی بیگ خاں سالک

میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو بیٹھ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور میرے خیالات اور احتمالات کو صورتِ وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا کہ بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشیں" خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ"

(دوزخ میں اس کو جگہ ملے اور ہادیہ یعنی جہنم میں اس کا ٹھکانا ہو۔) خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اوغلان (ترکی لفظ بمعنی جناب) صاحب۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا۔ بے حیا بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

(۲۱) بنام نواب ضیاء الدین خاں

جناب قبلہ و کعبہ،

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔ ایک جلد ہزار بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؛ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ۔ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی۔ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دتی اور لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو۔ وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں

بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو۔ وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوحِ سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا نقصان کچھ نہیں۔ ہاں احتمالِ نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم۔ اس صورت میں تلافی کا کفیل جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور جب طلب اس کی دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔

رحم و کرم کا طالب غالب

(۲۲) بنام میر سرفراز حسین

نورِ چشم راحتِ جان میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں۔ بڑے بیش قیمت ہیں، یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے: یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ + یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ۔

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے۔ وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہووں میں کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ میں ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔

(۲۳) بنام عزیزالدین

صاحب،

کیسی صاجزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی اسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شانِ انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو میں۔ لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں .... قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط جس کا آپ نے ذکر لکھا ہے، آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو۔ آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے اور خط کے نہ پہنچنے کی ان کو خبر پہنچائیے۔

غالب

(۲۴) بنام نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفقؔ

پیر و مرشد!

بارہ بجے تھے؛ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا؛ بھلے کو انگرکھا یا کرتا اپنے گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا، میرا نقصان ہوتا۔ سرے سے سنیے۔ آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اس کی رسید آئی۔ کئی کٹے ہوئے شعر الٹے آئے۔ ان کی قباحت پوچھی گئی۔ قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیے گئے۔ لو صاحب، یہ اشعار بھی قصیدے میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا کاغذ ان کو دیا۔ جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا، وہ آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا۔ شعر:

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے؛ تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں۔ خیر، اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے؛ باسی کڑھی میں ابال کیوں آئے۔ بندگی، بے چارگی۔

پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و

ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضاء میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ـــــ ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں۔ خریف کا بیڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینھ درکار ہے۔ کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا جائے گا۔

اہاہا، جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔ مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں، ان کے چھوٹے بھائی بھی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے۔ یہیں رہے۔ بعدِ فتحِ دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔

۱۸۶۰ء